ماہنامہ منادی - نئی دہلی

جلد ۳۸ شمارہ ۱۱، ۱۲

شروع بنام اللہ قلم کارکل نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

الفاتحہ

یارب زشراب عشق سرمستم کن یکبارہ بہ عشق پابستم کن

از ہر چہ زعشق خود تہی دستم کن درعشق خودت نیست کن وہستم کن

از دولت حسنت بمن ارزانی باد داغ نو وسوزے نو و دردِ تازہ

درد نو وسوزے نو وعشق ہر روز برجان دل شکستگان افزوں باد

از دست خیال توکہ درجان من است تاروز قیامت دل من پرخوں باد

یارب! محبت کی شراب سے مدہوش کر۔ عشق کی بندشوں میں جکڑ ڈال۔ نفس کی محبت سے پاک کردے۔ اور اپنی محبت میں فنا کرکے بقا عطا فرما۔ اپنے حسن کی دولت سے ایک نیا داغ۔ ایک نیا سوز اور ایک نیا درد بخش۔ الٰہی اس نئے درد، نئے سوز اور عشق میں دل شکستگاں کے لئے ہر روز اضافہ ہو اور جان کے ساتھ لگے رہنے والے تیرے خیال کے ہاتھوں قیامت تک میرا دل پرخوں رہے!

قرآن کے فرمان

اَلْيَوْمَ

اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (سورۂ مائدہ پ۶)

آج پاک چیزیں تمہارے لئے حلال کردی گئیں۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ (نحل پ۱۴)

پس کھاؤ اس میں سے جو رزق دیا ہے تم کو اللہ نے پاک طیب۔

وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ (نساء پ۴)

اور ناپاک کو پاک کے بدلے نہ لو

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (مائدہ پ۶)

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ

نبیؐ کا مرتبہ

(حضرت ملا واحدی دہلوی)

جس طرح عقل سے اللہ تعالیٰ کو صرف پہچانا جا سکتا ہے کہ زمین اور آسمان کے کارخانے خود بخود نہیں بن گئے اور خود بخود نہیں چل رہے ہیں۔ کسی نے انہیں بنایا ہے اور وہی انہیں چلا رہا ہے، مگر وہ کیسا ہے۔ یہ بتانا ممکن نہیں ہے۔ بغیر دیکھے بھلا کوئی کیونکر بتائے اسی طرح نبیؐ کو بھی عقل سے نہیں پہچانا جا سکتا ہے۔ نبوّت کی ماہیت سمجھنے اور سمجھانے سے عقل عاجز ہے۔

عام انسان یکساں نہیں ہوتے۔ دیوانوں اور فرزانوں، بدوں اور نیکوں، سب کو اعضا یکساں ملتے ہیں لیکن روح یکساں نہیں ملتی نبیؐ انسانوں کی طرح جنم لیتا ہے، انسانوں کی طرح پلتا بڑھتا ہے اور انسانوں کی طرح جیتا مرتا ہے۔ بہ ایں ہمہ عام انسانوں میں اور اُس میں اتنا فرق ہے کہ فرق کا اندازہ محال ہے۔

نبی کو ایک نسبت تو ہے خالق سے اور ایک نسبت ہے مخلوق سے۔ خالق کا نبی عبد اور رسول ہے، عام انسانوں جیسا برائے نام عبد نہیں واقعی عبد، لیکن مخلوق کے لئے نبی "بعد از خدا بزرگ" ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حکم دیا قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (الخ) کہو میں تم جیسا انسان ہوں (البتہ) مجھ پر (یہ یہ) وحی آئی ہے۔ حضورؐ انسانوں میں شامل ہیں مگر انسانوں سے ممتاز ہیں کیوں کہ حضورؐ پر وحی آتی تھی۔

اگر کہوایا جاتا کہ میں تم جیسا انسان ہوں لیکن تم سے زیادہ قوی ہوں، تم سے زیادہ عاقل ہوں یا تمہارا بادشاہ اور حاکم ہوں تو تصوّر کر لیا جاتا۔ انسانوں میں جو ممتاز ہو اس کا تصوّر ہم کر لیتے ہیں ارسطو اور افلاطون، شاہجہاں اور عالمگیر کا تصور مشکل نہیں ہے مگر جو انسانوں ہی میں نہیں، انسانوں سے ممتاز ہو اُس کا تصور اس کی صف ہی کے لوگ کر سکتے ہیں، یعنی انبیاء ہی جانتے ہیں کہ نبوّت کس شان کا امتیاز ہے جسے ایک شے سے واسطہ نہ پڑا ہو وہ اُس شے کی ماہیت کیا جانے گا۔ بُو کی کیفیت سونگھے بغیر اور کھانے کی لذت چکھے بغیر کون جان سکتا ہے۔ اور وحی تو سونگھی اور چکھی بھی نہیں جا سکتی۔ لہٰذا إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کا یقین کرنے کے ساتھ يُوحَىٰ إِلَيَّ کی طرف نظر رکھنی چاہیئے۔ يُوحَىٰ إِلَيَّ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اور ہر نبیؐ کو دوسرے عظیم ترین انسانوں سے اس طرح ممتاز کر دیتا ہے جس طرح انسان حیوانوں سے ممتاز ہیں۔

آج کل کے مسلمانوں اور خلفائے راشدین میں شاید ایک آدھ وصف مشترک نکل آئے لیکن خلفائے راشدین کی یہ مجال نہیں ہے کہ انبیا کی آخری صف میں کھڑے ہو جائیں۔ انبیاء کی نوع ہی الگ ہے ؎

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ یہ (نبوّت) اللہ کا (غیر معمولی) فضل ہے (نبوت) اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مختص کر لیتا ہے۔ امیر اور حاکم کے انتخاب کی طرح نبی کا انتخاب انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے امیر اور حاکم کو تو منتخب کرنے والے معزول کر سکتے ہیں۔ لیکن نبی قوائے نبوّت پیدائش کے وقت ساتھ لاتا ہے۔ حضورؐ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں:- "میں اُس وقت نبی تھا جس وقت آدم منزلِ آب و گِل میں تھے۔

نبوّت اکتسابی شے نہیں ہے۔ عبادت و ریاضت سے انسان ولی بن سکتا ہے، نبی نہیں بن سکتا۔ جس طرح فرشتہ نہیں بن سکتا۔ یہ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے جسے چاہے جانور کر دے۔

جسے چاہے انسان کردے اور جسے چاہے نبی کردے اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ اللہ خوب واقف ہے کہ اللہ اپنی پیام بری کا منصب کسے عطا فرمادے۔

انبیاء منصب نبوت سنبھالنے سے قبل جو عبادت و ریاضت کیا کرتے تھے، وہ بے شک اللہ ان سے قبولیت وحی کی استعداد کو ترقی دینے کے لئے کراتا تھا۔ انبیاء کی عبادتیں اور ریاضتیں ایسی ہیں جیسے انسان انسانیت کے ممکن الحصول کمالات حاصل کرنے کی غرض سے جدوجہد کرے۔ جب عام انسان اللہ کو خالق مان لینے کے بعد اللہ کے آگے جھکتا ہے اور چاہتا ہے کہ حق مخلوقیت و بندگی بجالاؤں تو نبی تو نبی ہے۔ منصب نبوت پر فائز ہونے والے انسان سے زیادہ حق مخلوقیت و بندگی ادا کرنے کا احساس اور کسے ہوگا۔ لیکن نبوت عبادت و ریاضت کے صلے میں عطا نہیں کی جاتی عبادت و ریاضت آثار نبوت میں سے ہے۔ اور نبی پر لازم ہے کہ حق مخلوقیت و بندگی نبھانا ہے لیکن عبادت اور ریاضت کے لئے لازمی نہیں ہے کہ اس کا کرنے والا نبی بن جائے۔ اچھا نسب، خوش شکل، نیک طینتی، معتدل مزاجی، سنجیدگی و متانت، راست گفتاری امانت داری وغیرہ بھی آثار نبوت میں ہیں۔ مگر ضروری نہیں ہے کہ ہر صحیح النسب، خوش شکل، نیک طینت، معتدل مزاج، سنجیدہ و متین، راست گفتار اور امانت دار نبی ہو۔ نبی کے محاسن قبل از بعثت اور غیر نبی کے محاسن میں ویسے بھی کچھ نہ کچھ فرق رہ جاتا ہے غیر نبی ٹھوکر پر ٹھوکر کھائے اور نبی کی شان یہ ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی تمہارے ساتھی (محمد رسول اللہ) نہ (کبھی) گمراہ ہوئے اور نہ کبھی بہکے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی اُن کی نگاہ صراط مستقیم سے (کبھی) نہیں ہٹی اور انہوں نے (کبھی) سرکشی نہیں کی۔

نبی کو اللہ تعالیٰ شروع سے اپنی خاص نگرانی میں رکھتا ہے وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ نبی کا دماغ کبھی غلط بات نہیں سوچتا اور اُس کی آنکھ ٹیڑھا راستہ نہیں پکڑتی۔ اُسے وہ روشنی دی جاتی ہے جو غیر نبی کو نہیں دی جاتی۔ اُسے خواہ کتنا ہی اقتدار مل جائے اُس میں غرور و تکبّر درشت مزاجی اور جفاکاری کا گزر نہیں ہوتا۔ وہ کبھی اتفاقاً خفیف سی چوک کرتا ہے تو اُسے ٹوک دیا جاتا ہے۔ اُسے صراط مستقیم سے بال برابر نہیں ہلنے دیا جاتا۔

نبی کو اللہ تعالیٰ جو دماغی توازن اور عقل و روحانی قوت دیتا ہے وہ دوسرے انسانوں کو نہیں دیتا۔ نبی ولادت سے وفات تک راہ راست پر خود ہی قائم نہیں رہتے، دوسروں کو راہ راست پر لانے کی اللہ تعالیٰ انہیں غیر معمولی قابلیت بخشتا ہے۔ نبی اچھے بُرے اور صحیح و غلط میں تمیز کرنے کی حقیقی صلاحیت پاتے ہیں۔ ان کا علم وجدانی ہوتا ہے وہ اچھائی اور بُرائی کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح انسان بھوک اور پیاس کو جانتا ہے۔

جس طرح انسان حرکت کرنے کے لئے ارادے اور اختیار کا محتاج ہے۔ اسی طرح ارادے اور اختیار کو صحیح راستے پر لگانے کے لئے نبی کا محتاج ہے۔ نبی کی رہنمائی کے بغیر سمجھ دار سے سمجھ دار انسان بہیمیت کے پھندے سے نہیں نکل سکتا اور اس کی ملکوتی قوت بہیمی قوت پر غالب نہیں آسکتی۔

اللہ کا ہر انسان کسی نہ کسی حد تک قائل ہے یا ہر انسان کی فطرت میں اللہ سے کسی نہ کسی قسم کے تعلق کا مادّہ موجود ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا (قرآن) اور کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ (حدیث) اللہ کے ماننے پر انسانی فطرت مجبور ہے۔ کوئی اللہ کہہ کر مانے یا خدا کہہ کر مانے، پرمیشور کہہ کر یا گاڈ کہہ کر مانے اللہ کے وجود کا منکر بھی ایک طاقت کا ضرور مقر ہے۔ دولت اور اقتدار کے نشے میں سرشار ہو جانے والوں کو بھی کبھی نہ کبھی اللہ کا سہارا ڈھونڈنا پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام محض اللہ کو مان لینے اور اللہ کے آگے جھکنے کا نام نہیں ہے۔ اسلام نام ہے اللہ کو اس طرح ماننے اور اللہ کے آگے اس طرح جھکنے کا جس طرح اللہ کے رسولؐ نے بتایا ہے۔

مسلمان کو نامسلمان سے ممیز کرنے والی چیز اقرار رسالت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ پہلے حضورؐ کو پہچانئے اور حضورؐ کی ہدایتوں کو سمجھئے۔ پھر حضورؐ کے ذریعہ اور حضورؐ کی ہدایتوں کے تحت اللہ تک پہنچئے۔ پہنچنا اللہ تک ہے لیکن

امتیاز ما ز نام مصطفےٰ است

ترے قدموں میں جینا ہو ترے قدموں پہ مرنا ہو

(از حضرت مولانا انوار الرحمٰن بسمل جے پوری)

جو حسن مخفیٔ لیلائے وحدت آشکارا ہو　　سراپا تیری صورت ہو سراپا نیر افشا ہو

جو دیکھے چشم باطن سے خدا کو کب برابر ہے　　وہ اسکے جس نے ان آنکھوں سے اپنی تجھکو دیکھا ہو

جو بوئے یوسفی سے دیدۂ یعقوب بینا ہو　　نہ کیونکر نکہتِ زلف نبیؐ سے چشم دل وا ہو

رہے گا پھر بھی فرق قم باذنی و باذن اللہ　　غلاموں سے ترے ظاہر جو اعجاز مسیحا ہو

اطاعت پر تمہاری منحصر ہے قرب یزدانی　　محبت جس کو ہو تم سے وہ خود محبوب مولا ہو

خدا وہ دن کرے اک مدینے جا کے رہ جاؤں　　ترے قدموں میں جینا ہو ترے قدموں پہ مرنا ہو

بٹھاؤں آپ کو سینے میں اور تربت میں لیجاؤں

وہاں تا حشر روئے یار ہو چشم تماشا ہو

آدمی نامہ

نائب سرکار مصطفےٰ حضور علی مرتضیٰؓ کے ارشادات

مرتبہ پاک دل محمد حسین محرم شاہ نظامی

۱۔ آدمی کو آخر گھمنڈ کس بات کا ہے؟ اسکی ابتداء ایک جرثومے سے ہوتی ہے اور خاتمہ ایک لاش پر! اس کو نہ زندگی کا اختیار ہے نہ موت کا!

۲۔ انسانوں کی مثال بھی درختوں کی سی ہے کہ وہ ایک پانی سے پرورش پاتے ہیں لیکن ہر ایک کا پھل مختلف ہوتا ہے۔

۳۔ سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو اپنے ہم جنسوں کے سب سے زیادہ کام آئے۔

۴۔ سب سے بُرا آدمی وہ ہے جو اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھے۔ جو سب کے عیب ڈھونڈتا پھرے اور اپنے عیبوں کی طرف سے اندھا ہو جائے۔

۵۔ بُرا آدمی کسی کی بھی بھلائی نہیں سوچ سکتا۔ کیونکہ جو صفت خود اس کے اندر نہیں پائی جاتی اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

۶۔ برا آدمی دوسروں کی برائیوں کی ہمیشہ حمایت کیا کرتا ہے کیونکہ اس کو اپنی برائیوں کا بچاؤ اسی صورت میں نظر آتا ہے۔

۷۔ اچھا آدمی تشدد کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ مگر اچھے برتاؤ کے سامنے جھک جاتا ہے اور کمینہ آدمی اچھے برتاؤ پر اکڑ جاتا ہے اور سختی سے دبتا ہے۔

۸۔ نیک آدمی کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوگی کہ وہ بدمعاش کی عزت کرنے لگے۔

۹۔ عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ اپنے بڑوں کا حکم مانے۔ اپنے برابر والوں کی عزت کرے۔ اور اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ انصاف کرے۔

۱۰۔ عالم آدمی جاہل آدمی کو سمجھ سکتا ہے کیونکہ وہ خود جاہل رہ چکا ہوتا ہے۔ لیکن جاہل آدمی عالم کو نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے علم سے بے واسطہ ہوتا ہے۔

(انگریزی سے تلخیص و ترجمہ)

مسلسل　　　قسط نمبر (۵۹)

فوائد الفواد

ملفوظات سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی رض

از صاحب الفضل علامہ حسن علا سنجری ～～～ جلد دوم ～～～ ترجمہ حسن ثانی نظامی دہلوی

ذکر ترک دنیا

آدینہ پنجم ماہ مبارک ذی الحجہ سنتہ احدی عشر و سبعمائتہ بسعادت پابوس رسیدہ شد۔ پیش از نماز هم در خانہ کہ پیش مسجد آدینہ کیلوکھری است، حکایت در ترک دنیا افتاد فرمود کہ وقتی رسول علیہ السلام با یاران میگفت کہ درویشی را مخیر کردند کہ تو دنیا و آنچہ در ویست اختیار می کن یا آنچہ در عقبیٰ برائے تو مہیا کردند۔ آن درویش گفت آنچہ در عقبیٰ برای من مہیا کردند ہماں اختیار کردم۔

چوں ایں حکایت تمام شد امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ گریستن گرفت۔ صحابہ پرسیدند کہ حال چیست گفت آنچہ مصطفیٰ فرمود علیہ الصلوٰۃ والسلام کہ درویشی را میان دنیا و عقبیٰ مخیر کردند آن درویش ہم مصطفیٰ است صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ المخیر ہو المخیر۔

ہم چوں خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر بریں حرف رسید فرمود کہ شیخ الاسلام فریدالدین را قدس سرہ العزیز بر مثل ایں کلمات بود بارہا گفتی کہ وقتی درویشی را چنیں حال بود یا درویشی چنیں چیزی کرد۔ من معلوم کردم کہ حکایت خود می گوید کہ حضرت شیخ اند

دنیا چھوڑنے کا ذکر

۷۱۱ھ ذی الحجہ کے مبارک مہینے کی پانچویں تاریخ جمعے کے روز قدم بوسی کی سعادت تک رسائی ہوئی۔ جامع مسجد کیلوکھری کے سامنے والے مکان میں نماز سے پہلے ترک دنیا کا تذکرہ تھا۔ فرمایا کہ ایک دفعہ رسول اللہ علیہ السلام نے اصحاب سے فرمایا کہ ایک درویش کو اختیار دیا گیا کہ چاہے تم دنیا اور جو کچھ اسمیں ہے اسکو اختیار کرلو اور چاہے اسکو پسند کرلو جو آخرت میں تمہارے لئے مہیا کیا گیا ہے۔ درویش نے کہا کہ جو کچھ آخرت میں میرے لئے مہیا کیا گیا ہے میں اسکو پسند کرتا ہوں۔

جب یہ حکایت ہوچکی تو امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ صحابہ نے پوچھا کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا کہ حضور مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو فرمایا کہ ایک درویش کو دین و دنیا میں مختار کیا گیا ہے۔ ان درویش سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

جب خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر (محبوب الٰہی رض) اس بات پر پہنچے تو فرمایا کہ شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہ العزیز بھی اسی طرح اکثر کہا کرتے تھے کہ ایک درویش کا یہ حال تھا یا ایک درویش نے یہ کیا۔ اور میں سمجھ جاتا تھا کہ حضرت خود اپنا قصہ بیان فرما رہے ہیں۔

ذکر بزرگی و ملاقات او با خضر علیہ السلام

انگاہ از سبب ترک دنیا حکایتے فرمود کہ بزرگی بود از بزرگان وقتی مصلے بر روئے آب انداختہ بود و نماز میکرد و می

ایک بزرگ اور ان سے خضر علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر

پھر ترک دنیا کے ضمن میں حکایت بیان فرمائی کہ بزرگوں میں سے ایک بزرگ تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ پانی پہ مصلا بچھا کر نماز

گفت خداوندا خضرؑ بر کبیرہ ارتکاب میکند اورا ازاں توبہ دہ۔ ہم درین میان خضر حاضر شد۔ گفت ای بزرگ من کدام کبیرہ ارتکاب می کنم تا ازاں توبہ کنم۔ آں بزرگ گفت کہ تو درختی در بیاباں نہال کردہ و در سایہ آں می نشینی و آسائش می گیری و می گوئی کہ برای خدا کردہ ام۔ در حال مستغفر شد۔ بعد ازاں آں بزرگ در معنی ترک دنیا با خضر علیہ السلام گفت کہ ہم چنیں باش کہ من می باشم۔ خضر گفت تو چگونہ می باشی وچہ می کنی۔ آں بزرگ گفت کہ من ہم چنینم کہ اگر جملہ دنیا مرا دہند وگویند کہ قبول کن کہ حساب بر تو نخواہد بود و ایں ہم گویند کہ اگر قبول نخواہی کرد ترا در دوزخ خواہند برد من دوزخ قبول بکنم دنیا قبول نکنم۔ خضر علیہ السلام گفت چرا گفت زیرا کہ دنیا مبغوض حق تعالے است چیزیکہ خدائے تعالیٰ آں را دشمن داشت من بجائے آں دوزخ قبول کنم وآنرا قبول نہ کنم۔

پڑھی اور کہنے لگے خداوندا! خضر علیہ السلام سے کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہے ان کو اس سے توتوبہ عطا فرما! اتنے میں خضر علیہ السلام بھی آگئے اور بولے کہ اے بزرگ میں نے کون سا گناہ کیا ہے جس سے توبہ کروں۔ بزرگ نے کہا کہ تم نے صحرا میں ایک درخت لگایا تھا۔ اس کے سایے میں خود بیٹھتے ہو اور آرام اٹھاتے ہو۔ اور پھر کہتے ہو کہ یہ کام میں نے خدا واسطے کیا ہے۔ انھوں نے اسی وقت توبہ کی۔ اس کے بعد ان بزرگ نے ترک دنیا کی بابت خضر علیہ السلام سے کہا کہ ایسے ہو جاؤ جیسا میں ہوں۔ خضر علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ کیسے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ بزرگ نے جواب دیا کہ میں ایسا ہوں کہ اگر ساری دنیا مجھے دی جائے اور کہا جائے کہ اسے قبول کرو تم سے اس کا کچھ حساب نہیں لیا جائیگا اور یہ بھی کہا جائے کہ اگر قبول نہ کروگے تو تم کو دوزخ میں لیجایا جائے گا تو میں دوزخ کو قبول کرلوں گا مگر دنیاداری کو پسند نہیں کروں گا۔ خضر علیہ السلام نے دریافت کیا کہ یہ کیوں؟ فرمایا کہ دنیا پر حق تعالےٰ کا غضب ہوا ہے۔ پس جس چیز کو خدا نے دشمن بتایا ہے میں اسکی جگہ دوزخ قبول کرلوں گا مگر اس چیز کو قبول نہیں کروں گا۔

سلطان المشائخ کے فیض یافتگان

(تیسری قسط)

حضرت خواجہ قطب الدین منوّر نظامی

(ادارہ)

قدیم تعلق حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کے مریدوں اور خلفاء میں دو بزرگ ایسے ہیں جن کو کئی پشت سے نسبت کی سعادت حاصل تھی۔ ایک حضرت بابا صاحب کے نواسے حضرت خواجہ سید محمد امام نظامی بن حضرت خواجہ بدرالدین اسحٰق اور دوسرے حضرت خواجہ قطب الدین منور ابن خواجہ برہان الدین بن حضرت خواجہ جمال الدین ہانسوی۔

حضرت خواجہ جمال ہانسوی حضرت بابا صاحب کے بڑے جلیل القدر اور برگزیدہ خلفاء میں تھے۔ یہاں تک کہ حضرت بابا صاحب اپنے مریدوں کو خلافت دینے کے بعد حکم دیتے تھے کہ ہانسی جاکر جمال ہانسوی سے اس کی تصدیق کراؤ۔ چنانچہ سلطان المشائخ کو بھی خلافت کے ساتھ ہانسی جانے کا فرمان ملا تھا۔ اور حضرت جمال ہانسوی نے اس خلعت کے ساتھ خلافت نامے کی تصدیق و تائید کی تھی کہ

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس

خدا کا ہزار ہزار شکر کہ موتی اس کو سونپا گیا جو موتی کا قدر شناس ہے!

سلطان المشائخ اور حضرت قطب الدین منور کے دادا حضرت جمال ہانسوی آپس میں پیر بھائی تھے

اور حضرت جمال ہانسوی ارادت اور خلافت دونوں میں محبوب الٰہی سے سینئر تھے۔ لیکن بقول کسے

جس کو پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے

محبوب پاک بابا صاحب کے خاص منظور نظر تھے۔ اس لئے حضرت جمال ہانسوی بھی ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ اور محبوب پاک کی کم عمری کے باوجود ان کو کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے۔ البتہ جب حضرت محبوب الٰہی کو خلافت مل گئی تو انھوں نے کھڑے ہو کر تعظیم دینے کا معمول ترک کر دیا۔ حضرت محبوب الٰہی کے دل میں ایک دفعہ خیال گزرا کہ شاید حضرت جمال کو میری خلافت پسند نہیں آئی ہے مگر حضرت جمال نے اس خیال کو محسوس کر کے فوراً کہا کہ مولانا نظام الدین کھڑے ہو کر تعظیم دینے کا معمول میں نے اس وجہ سے چھوڑا ہے کہ اب مجھ میں اور آپ میں خاص محبت ہے۔ بس اس یگانگت اور محبت میں ایک دوسرے کو تعظیم دینے کی کچھ خاص ضرورت نہیں رہی۔

ایک دفعہ حضرت محبوب الٰہی حضرت جمال ہانسوی خواجہ شمس دبیر وغیرہ مرید حضرت بابا صاحب سے رخصت ہونے لگے تو مریدوں کے دستور کے مطابق حضرت جمال ہانسوی نے بابا صاحب سے درخواست کی کہ کچھ وصیت فرمایئے۔ حضرت بابا صاحب نے فرمایا کہ ہماری وصیت یہی ہے کہ مولانا نظام الدین کو اپنی مصاحبت میں خوش رکھنا!

پہلی کا چاند حضرت جمال ہانسوی کا وصال بابا صاحب کے سامنے ہی ہو گیا تھا۔ ان کی ایک خادمہ تھیں، جو پیغام سلام لے کر اکثر بابا صاحب کے پاس جایا کرتی تھیں اور ان کو بابا صاحب مادر مومناں کہتے تھے۔ حضرت جمال کے وصال کے بعد مادر مومناں ان کے فرزند خواجہ برہان الدین کو جو خواجہ قطب الدین منور کے والد تھے حضرت بابا صاحب کی خدمت میں لے گئیں۔ خواجہ برہان الدین اس وقت بہت چھوٹے تھے لیکن بابا صاحب نے ان کی بڑی تعظیم تکریم کی اور مرید کرنے کے بعد وہی خلافت نامہ اور تبرکات جو حضرت جمال کو دے رکھے تھے خورد سال خواجہ برہان الدین

کو بھی عطا کر دیئے۔ اور فرمایا کہ جس طرح جمال الدین کو ہماری طرف سے اجازت تھی تم کو بھی ہے۔ البتہ تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ مولانا نظام الدین (یعنی حضرت سلطان المشائخ) کی خدمت میں رہنا۔ مادر مومناں نے یہ سن کر عرض کی کہ برہان الدین تو ابھی "بالا" (بچہ) ہے خلافت کا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے! حضرت بابا صاحب نے فرمایا کہ چودھویں کا چاند پہلی تاریخ کو "بالا" ہی ہوتا ہے۔ اور آخر یہی بالا کمال کو پہنچتا ہے! ع

برگِ توت است کہ گشتہ است بتدریج اطلس[1]

تکمیل خواجہ برہان الدین حضرت بابا صاحب کے فرمان کے مطابق ہر سال محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہو کر تربیت حاصل کرتے رہے۔ اور آخر کار درجۂ کمال کو پہنچ گئے مگر انھوں نے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا۔ جو بھی ان کے پاس مرید ہونے آتا اسے حضرت محبوب الٰہی کے پاس بھیج دیتے۔ اور اگر حضرت محبوب پاک فرماتے کہ جس طرح مجھے بابا صاحب کی خلافت ہے اسی طرح آپ کو بھی ہے۔ آپ مرید کیوں نہیں کرتے تو اس وقت بھی وہ یہی فرما دیتے کہ آپ جیسے بزرگ کے ہوتے ہوئے میرے لئے یہ کام مناسب نہیں ہے۔

تیسری پُشت "پیرزادوں کے رئیس" اور سونے چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے کی کہاوتوں کے لحاظ سے حضرت خواجہ قطب الدین خاندانی اور پیدائشی درویش تھے۔ ایک طرف انکو حضرت امام ابو حنیفہ کی اولاد امجاد سے ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اور دوسری طرف حضرت محبوب پاک سے خلوص وارادت میں ان کی تیسری پشت تھی۔ اس لئے وہ علم وعمل اور عشق ومحبت کے لازوال خزانوں سے ایسے مالا مال تھے کہ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ سلطان المشائخ کا فیض ان کے رگ وریشے میں جاری وساری تھا۔ اور آنکھ کھولتے ہی انھوں نے اپنے گھر کو محبوبی نعمتوں سے معمور دیکھا تھا۔ اس لئے دلّی میں حاضری کا اتفاق کم ہونے کے باوجود وہ سر سے پیر تک نظامی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

[1] شہتوت کا پتا ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ ریشم بن جاتا ہے!

خلافت حضرت خواجہ قطب الدین منور اور حضرت نصیر الدین چراغ دلّی کو ساتھ ساتھ خلافت عطا ہوئی تھی۔ پہلے حضرت نے خواجہ قطب الدین منور کو پاس بلا کر خرقہ خلافت اور وصیت سے سرفراز فرمایا اور دو رکعت شکرانے کے پڑھنے کا حکم دیا۔ اور پھر حضرت چراغ دلّی کو خرقۂ خلافت عطا ہوا۔ جب یہ دونوں نماز شکرانہ ادا کر کے حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ دونوں ایک دوسرے سے گلے ملو اور ایک دوسرے کو مبارکباد دو۔ پھر فرمایا کہ تم دونوں بھائی ہو۔ اول وآخر کا خیال نہ کرنا۔

خلافت کے بعد جب خواجہ قطب الدین منور سلطان المشائخ سے رخصت ہونے لگے تو حضرت نے فرمایا کہ تمہارے دادا شیخ جمال الدین ہانسوی کو کتاب عوارف والمعارف کا ایک نسخہ حضرت بابا صاحب نے خلافت کے وقت عطا فرمایا تھا لیکن جب میں بابا صاحب کی خلافت سے مشرف ہو کر ہانسی گیا تو حضرت جمال ہانسوی نے عوارف کا یہ نسخہ مجھے دے دیا اور کہا کہ حضرت بابا صاحب نے یہ کتاب مجھے بڑی نعمتوں کے ساتھ عطا فرمائی تھی۔ اب میں اس امید میں آپ کی نذر کرتا ہوں کہ شاید میرے کسی فرزند کو آپ کی ارادت کی سعادت نصیب ہو۔ اور اس وقت آپ اس کتاب کو دینی اور دنیاوی نعمتوں کے ساتھ اسے عطا کر دیں۔ لہٰذا اب میں ہر قسم کی نعمتوں کے ساتھ یہ کتاب تم کو سونپتا ہوں!

شخصیت پشتینی پیرزادہ ہونے کی وجہ سے حضرت قطب الدین منور کی طبیعت میں استغنا اور وقار بدرجہ اتم تھا۔ خلقت کے ہجوم امراء کی امارت کو وہ کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نہایت استقامت کے ساتھ اپنے آبائی گوشے میں مسکن گزیں رہتے تھے۔ مگر ان کا یہ استغنا اور وقار درد ومحبت میں آراستہ تھا۔ تقریر بڑی دلکش فرماتے تھے۔ اور جو آدمی ان کی گفتگو سن لیتا تھا محبت کی آگ اپنے سینے میں لے کر اٹھتا تھا۔ پیر سے اس درجہ محبت تھی کہ ان کا نام نامی آتے ہی حضرت رونے لگتے۔ اور اس قدر روتے کہ حاضرین کو بھی رونا آجاتا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت قطب الدین منور کے خلاف مخالفوں نے سلطان محمد تغلق کے کان بھرنے شروع کئے۔ اور اس کو حضرت کا مخالف بنا دیا۔ لیکن سلطان کو کوئی بہانہ نہیں ملتا تھا کہ حضرت

کو تکلیف پہنچائے۔ آخر ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آئی کہ حضرت کو جاگیر دے دی جائے۔ اور پھر جاگیر کے سلسلے میں کوئی بہانہ ڈھونڈھ کر حضرت کے خلاف کارروائی کی جائے۔ چنانچہ اپنے قاضی خواجہ کمال الدین کو دوگاؤں کا فرمان دے کر حضرت کے پاس بھیجا اور ہدایت کردی کہ کسی نہ کسی طرح حضرت سے یہ جاگیر قبول کرالینا۔

قاضی صاحب ہانسی آئے۔ اور فرمان کو آستین میں چھپا کر حاضر خدمت ہوئے۔ مگر حضرت ان کی آمد کی خبر سنتے ہی طاق صفہ میں جا بیٹھے جہاں کبھی حضرت باباصاحب تشریف فرما رہ چکے تھے۔ قاضی کمال الدین صدر جہاں نے حضرت کی خدمت میں بادشاہ کی طرف سے اخلاص و محبت کا اظہار کرنے کے بعد جاگیر کا فرمان پیش کیا۔

فرمان کو دیکھ کر حضرت قطب منور نے کہا کہ جس وقت سلطان ناصر الدین اچھ اور ملتان کی طرف جارہا تھا اور سلطان غیاث الدین نائب السلطنت تھا تو سلطان نے اپنے نائب کے ذریعے اسی طرح حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں دو گاؤں کا فرمان بھیجا تھا۔ مگر حضرت باباصاحب نے غیاث الدین سے فرمادیا تھا کہ ہمارے پیروں نے اس قسم کی چیزیں قبول نہیں کی ہیں۔ ان کے خواہشمند اور بہت ہیں ان کو دو۔ پس قاضی صاحب! آپ صدر جہاں اور مسلمانوں کو وعظ و نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ کا فرض تو یہ ہے کہ اگر ہم اپنے پیروں کی روش کے خلاف چلیں تو آپ ہم کو روکیں اور نصیحت کریں۔ لیکن آپ تو الٹا مجھے ایک ایسے کام کی طرف بلا رہے ہیں جو ہمارے پیروں کے طریقے کے سراسر خلاف ہے! قاضی کمال یہ سن کر کھسیانے ہو گئے اور معافی مانگ کر رخصت ہو گئے۔ اور بادشاہ کے پاس جاکر نہایت عمدگی کے ساتھ حضرت قطب منور کی کرامت و عظمت کا تذکرہ کیا۔ جس سے اس کا دل نرم ہوگیا۔

ایک دفعہ سلطان محمد تغلق ہانسی سے چار کوس کے فاصلے پر مقیم تھا۔ وہاں سے اس نے مخلص الملک نظام الدین کو ہانسی بھیجا تاکہ وہاں کے قلعے کی شکست و ریخت کا معائنہ کرے۔ یہ شخص مجسم ظلم تھا۔ ہانسی میں جب وہ حضرت قطب الدین منور کے مکان کے پاس سے گزرا تو پوچھنے لگا کہ کس کا مکان ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ سلطان المشائخ کے خلیفہ شیخ قطب الدین منور یہاں رہتے ہیں۔ یہ سن کر وہ کہنے لگا کہ تعجب ہے کہ بادشاہ اس شہر کے قریب مقیم ہے۔ اور یہ اس سے ملنے نہیں جاتے۔ پھر بادشاہ کے پاس آکر اس سے بھی یہی بات کہی کہ فلاں بزرگ یہاں رہتے ہیں مگر آپ سے ملنے نہیں آتے۔ بادشاہ کو اپنی شاہی کا غرور تھا۔ اس نے فوراً حسن برہنہ نامی کو بھیجا کہ حضرت کو بلا لائے۔ حسن برہنہ حضرت کے مکان پر پہنچا اور اپنے شاہی کرو فر کو دور چھوڑ کر خود حضرت کی چوکھٹ پر جا بیٹھا۔ حضرت اس وقت بالا خانے پر تھے۔ عبادت سے فارغ ہو کر انھوں نے نور باطنی سے محسوس فرمالیا کہ حسن برہنہ نامی چوکھٹ پر بیٹھا ہے۔ چنانچہ حضرت نے اپنے صاحبزادے کو نیچے بھیجا کہ حسن کو بلا لاؤ۔ حسن نے حاضر ہو کر سلام عرض کیا اور کہا کہ بادشاہ نے آپ کو بلایا ہے۔

حضرت نے پوچھا کہ اس جانے میں میرا اختیار ہے یا نہیں؟ حسن نے جواب دیا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ جس طرح ہو سکے لے آؤ۔ حضرت نے کہا اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ میں اپنے اختیار سے بادشاہ کے پاس نہیں جاتا۔ پھر گھر والوں کو مخاطب کرکے کہا تم سب کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اور مصلے کندھے پر ڈال ہاتھ میں عصا لے پیدل روانہ ہوگئے۔ حسن برہنہ نے جب روئے انور پر بزرگی کی علامت دیکھیں تو ادب سے عرض کیا کہ یہاں سے شاہی بارگاہ بہت دور ہے۔ آپ پیدل نہ چلیں گھوڑا موجود ہے۔ حضرت نے جواب دیا۔ گھوڑے کی کچھ ضرورت نہیں ہے مجھ میں پیدل چلنے کی طاقت ہے۔ جب اپنے آباؤ اجداد کے مدفن کے قریب پہنچے تو حسن سے اجازت لے کر فاتحہ پڑھی اور مزاروں کے پائین کھڑے ہو کر کہا کہ میں آپ کے روضے سے اپنے اختیار کے ساتھ نہیں جارہا۔ مجھے مجبور کیا گیا ہے۔ چند بندگان خدا یعنی آپ کے لوٹے لے کر چلے ہیں۔ یہ کہہ کر روضے سے باہر آئے تو ایک شخص کچھ روپے لئے کھڑا تھا۔ حضرت نے پوچھا کیا ہے۔ اس نے عرض کی میں نے کسی کام کے لئے منت مانی تھی وہ پورا ہوگیا۔ اب میں یہ روپیہ بطور شکرانہ لایا ہوں۔ قبول فرمائیے۔ حضرت نے یہ روپیہ گھر بھجوادیا اور چار کوس پیدل چل کر شاہی دربار میں پہنچے مگر بادشاہ حضرت

سے نہیں ملا اور دلی روانہ ہوگیا۔ اور حضرت کو ساتھ رکھا۔ دلی جاکر ملاقات کے لئے بلوایا۔ بادشاہ کا ولی عہد فیروز تغلق فقیر دوست آدمی تھا۔ اس نے حضرت سے کہا کہ لوگوں نے بادشاہ کو آپ کے خلاف بھڑکا رکھا ہے اس لئے آپ ملاقات کے وقت جہاں تک ہوسکے نرمی تواضع اور اخلاق کا برتاؤ فرمائیں تاکہ اس کی غلط فہمی دور ہوجائے۔

حضرت دربار میں داخل ہوئے تو ان کے صاحبزادے نورالدین صاحب پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ان کو کبھی شاہی کروفر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے وہ امراء و رؤسا کی شان و شوکت دیکھ کر کسی قدر ہراساں ہوئے۔ حضرت نے نورِ باطنی سے اس کو محسوس کیا اور پلٹ کر صاحبزادے سے کہا۔

"بیٹا! تمام بزرگی اور عظمت اللہ تعالےٰ ہی کو حاصل ہے!"

جب بادشاہ نے حضرت کو آتے دیکھا تو ان کی طرف سے تغافل برت کر تیراندازی کے کھیل میں مصروف ہوگیا۔ مگر حضرت قریب تشریف لائے اور بادشاہ نے نظر بھر کر حضرت کو دیکھا تو فوراً متوجہ ہوکر مصافحہ کیا اور کہنے لگا کہ میں آپ کی ولایت میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن آپ نے میری تربیت نہیں فرمائی۔ اور ملاقات تک نہ کی۔ حضرت نے جواب دیا کہ میں ایک درویش ہوں۔ اپنے آپ کو بادشاہوں کی ملاقات کے لائق نہیں پایا۔ بس ایک کونے میں بیٹھ کر سب کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اس لئے آپ مجھے درباداری سے معذور سمجھیں۔ حضرت کی اس کھری گفتگو سے محمد تغلق بہت متاثر ہوا اور اپنے ولی عہد فیروز تغلق سے کہنے لگا کہ حضرت کا جو مقصد بھی ہو پورا کیا جائے۔ حضرت نے فوراً کہا کہ میرا مقصود ذاتِ الٰہی اور اپنے آباؤ اجداد کا روضہ ہے۔ مجھے وہاں واپس جانے کی اجازت دی جائے۔

حضرت کے روانہ ہونے کے بعد محمد تغلق کہنے لگا کہ اب تک میں نے جتنے مشائخ سے بھی ملاقات کی ہے۔ ان سب کے ہاتھ مصافحے کے وقت کانپتے ہوئے محسوس کئے۔ لیکن شیخ قطب الدین منور نے بڑی سختی سے میرا ہاتھ پکڑا اور آپ کے چہرے پر میں نے انوار کا مشاہدہ کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ ان کی بابت لوگوں نے حسد کی بنا پر مجھ سے شکایت کی تھی۔ ورنہ حقیقت میں حضرت ولیٔ کامل ہیں اس کے بعد اس نے مولانا ضیاءالدین برنی کو ایک لاکھ سکّے دیکر حضرت کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت نے ان کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ بادشاہ کے پاس اس انکار کی خبر پہنچی تو اس نے کہا کہ اگر ایک لاکھ قبول نہیں کرتے تو پچاس ہزار ہی پیش کرو۔ مگر حضرت نے اس سے بھی انکار کیا کہ اس درویش کو تو دو سیر کھچڑی اور تھوڑا گھی کافی ہوجاتا ہے۔ ان ہزارہا سکوں کا کیا کرے گا۔ مولانا ضیاء الدین برنی اور فیروز تغلق نے بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کی کہ حضرت کم از کم دو ہزار ضرور قبول فرمالیں۔ اس سے کم کا ذکر ہم بادشاہ کے سامنے نہیں کرسکتے کیونکہ وہ اس میں سبکی محسوس کرے گا۔ ان لوگوں کے مجبور کرنے سے حضرت نے دو ہزار سکّے لے لئے۔ مگر اس میں سے کچھ روپیہ حضرت خواجہ قطب صاحب اور حضرت محبوب الٰہی کے روضوں پر خرچ کردیا۔ کچھ حضرت نصیرالدین چراغ دہلی کی خدمت میں بھیج دیا۔ اور باقی مختلف اشخاص کو بانٹ کر اسی وقت قصہ ختم کردیا۔ اور ہانسی واپس تشریف لے گئے۔

حضرت خواجہ قطب الدین منوّر کا روضۂ پُرانوار آج بھی ہانسی ضلع حصار پنجاب میں مرجع خلائق ہے۔

منقبت

مولائے کائنات حضرت علیؓ

از حضرت مولانا شاغل نظامی

علیؓ شاہِ گردوں رکاب اللہ اللہ
اخیٔ رسالت مآبؐ اللہ اللہ
کہا شیر یزداں نبیؐ نے علیؓ کو
کبھی کہہ دیا بو تراب اللہ اللہ
علیؓ کو زبانِ رسولؐ خدا سے
ملے بیسیوں ہیں خطاب اللہ اللہ
نکھارا شریعت کا گلشن علیؓ نے
طریقت کو دی آب و تاب اللہ اللہ
قناعت میں بے مثل تھی ذاتِ حیدرؓ
سخاوت میں بھی لاجواب اللہ اللہ
نبیؐ رحمتِ ربِّ ہر دو سرا ہیں
علیؓ ہیں کرم کے سحاب اللہ اللہ
اشارے سے انگشتِ دستِ علیؓ نے
دیا توڑ اِ خیبر کا باب اللہ اللہ
میسر ہے شاغل کو دستِ علیؓ سے
خمِ معرفت کی شراب اللہ اللہ

منقبت

حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ غریب نوازؒ

جو انسان سترِ راہِ اُلفتِ یزداں سمجھتے ہیں
درِ خواجہؒ کو بابِ منزلِ عرفاں سمجھتے ہیں
اے خواجہؒ لوگ تم کو ہند کا سلطاں سمجھتے ہیں
مگر ہم تاجدارِ عالمِ عرفاں سمجھتے ہیں
تمہارے دم قدم سے باغِ ملت میں بہار آئی
تمہیں ہم دینِ احمدؐ کا گلِ خنداں سمجھتے ہیں
کرم گستر، گدا پرور، مہِ حیدر، شہِ سنجر
لقب یہ سب تمہاری شان کے شایاں سمجھتے ہیں
رسول اللہؐ نے قطب المشائخ تم کو فرمایا
تمہارے در کو سب گنجینۂ عرفاں سمجھتے ہیں
تمہارے فیض کی ہے روشنی بھارت میں اے خواجہؒ
تمہیں ہم دینِ احمدؐ کا مہِ تاباں سمجھتے ہیں
مہِ سنجر کے جلوؤں نے مجھے حیراں بنایا ہے
تری حیرت کو ہم اے دیدۂ حیراں سمجھتے ہیں
تمہارے ہجر کو نارِ سقر گر دانتے ہیں ہم
تمہارے وصل کو فردوسِ دل داماں سمجھتے ہیں
مداوا ہے ہوا اجمیر کی ان کے لئے شاغل
جو عشقِ خواجۂ ذی جاہ کو درماں سمجھتے ہیں

اردو گلستاں

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا منتخب روزنامچہ

۲۰ شعبان ۱۳۵۰ھ جمعرات - ۳۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کلکتہ

گڈ بائی مسٹر اولڈ ایر } چلا۔ چلا عیسائیوں کا سال دنیا سے چلا۔ کل نیا سال آجائے گا۔ اور انسان کے کان میں کہے گا کہ نہ ۳۱ء گیا اور نہ ۳۲ء آیا۔ یہ تو تیرا حساب ہے۔

فلم ریویو کے ایڈیٹر } ایم۔ وائی طارق اچھے خاصے دیکھنے دکھانے کے قابل مسلمان نوجوان ہیں۔ محمد یعقوب نام ہے بہت چھوٹے تھے اس وقت سے ان کو جانتا ہوں۔ قومی جوش بہت زیادہ ہے اسی واسطے اپنا لقب مشہور فاتح حضرت طارق کے نام پر رکھا ہے۔ مگر انگریزیت کا طلسم دیکھو ایم وائی بھی طارق کے ساتھ جوڑتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ جبل طارق انگریزوں کے قبضہ میں ہے!

شال کی دوکان پر } صبح ڈھاکہ بلڈنگ میں اپنے امرتسری دوست ملک غلام محمد صاحب تاجر شال سے ملنے گیا تھا۔ یہ بڑے ثابت قدم اور وضعدار مسلمان ہیں۔ سالہا سال سے اس مکان میں رہتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں جس کے زینے میں جانا ایک قیامت ہے۔ دونوں طرف کی دیواریں پان کی پیکوں سے لال۔ نزلہ زکام کی ہر قسم کی یادگاریں سیڑھیوں پر ایسی آراستہ جیسے آسمان پر کہکشاں اور زمین پر سبزہ۔ لامانا۔ بمشکل دامنوں کو سمیٹ کر آیا اور گیا۔ اگر خدا صفائی اور نفاست کا احساس مجھ کو نہ دیتا تو اس گنجان زینے پر دامن کی جھاڑو دیتا ہوا چلتا اور جملہ ابن آدم بن جاتا۔

قوالی } حضرت مولانا قطب میاں صاحب (مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلی) کے کمرے میں گیا۔ مولانا الطاف الرحمٰن صاحب کے بلال صورت قوال نے حضرت حافظ کا کلام سنایا۔ کلام بھی شکیلا۔ آواز بھی دھار دار اور قوال کی طرز ادا بھی نشتر نما۔ مجھ پر اور حاجی سید وزیر علی صاحب پر بہت ہی اثر ہوا۔ معلوم ہوتا ہے ہر کالی چیز میں جادو ہوتا ہے۔ میں کالا ہوتا تو آسانی سے جادوگر مشہور ہو جاتا۔

۲۱ شعبان ۱۳۵۰ھ جمعہ یکم جنوری ۱۹۳۲ء کلکتہ

گڈ مارننگ مسٹر نیو ایر۔ ویلکم اینڈ گو بیک!

ولیمہ } آج حاجی آدم عبدالرحیم کی شادی کا ولیمہ ہے۔ رات کی مجلس میں بہت سے یورپین اور ہندو بھی آئے تھے اور مسلمان و روٴسا بھی بہت زیادہ تھے۔ آج ولیمے میں بھی کثرت لوگ آرہے ہیں۔

روانگی } آج مجھے کلکتے سے روانہ ہونا ہے۔ ڈاک گاڑی میں انتظام کیا ہے۔ کل صبح پھلواری شریف میں ٹھیروں گا۔

مغرب کے بعد ریل پر گیا۔ حکیم خسرو شاہ نظامی اور حاجی سید وزیر علی صاحب اور ملک عبدالودود خاں نظامی اور یحییٰ نظامی اور علی جان نظامی وغیرہ احباب ریل تک آئے۔ مگر جنھوں نے میرا بستر بچھایا۔ وہ شاید صاحب لوگ تھے۔ کیونکہ صاحب لوگ اپنا بستر بستر بند سے الگ نہیں کرتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے جسم پر گوشت بہت ہوتا ہے۔ جب ریل چلی تو میں نے بستر کو دیکھا۔ گاڑی میں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی میری سیٹ اوپر تھی اس لئے میں پورے آدھ گھنٹے تک کھڑا سوچتا رہا کہ اس بستر کو ٹھیک کروں یا یوں ہی سو جاؤں۔ ہمت نے کہا تم تو ابوالحسن تاناشاہ سے بھی زیادہ نازک مزاج ہو۔ نارنگی کے چھلکے پر تمہاری موٹر کا پہیہ چلے تو تم کو نزلہ ہو جائے۔

بھلا یہ موٹے موٹے بکسوے اور تسمے جو بستر بند کے نیچے کھل بنے ہوئے ہیں رات کو سونے دیں گے؟ چلو آگے بڑھو رعبت کا یہ ملک فتح کرو۔ سب مسافر منہ ڈھکے لیٹے تھے۔ میں نے کسی پر اپنا لحاف ڈالا اور کسی پر توشک اور کسی پر تکیہ اور کسی پر چادر۔ دس منٹ کے بعد میاں بستر بند اکیلے رہ گئے اور میں نے ان کو سمیٹ کر نیچے ڈال دیا۔ پھر دری بچھائی اور اس پر توشک بچھائی اور اس پر سفید چادر۔ پائینتی لحاف رکھا اور سرہانے تکیہ۔ اور اپنی عوج بن عنق جیسی ٹانگوں کو حرکت دی اور اڑ کر چھت پر چلا گیا۔ اور اپنی مستعدی کی دل ہی دل میں خوب تعریف کی۔ بخار موجود تھا۔ اب ذرا بڑھ گیا۔ رات بھر میں اس کے آغوش میں اور وہ میرے پہلو میں۔ صبح ہو گئی۔ مولوی صاحب شبہ نہ کریں۔ میں بخار کے پہلو میں تھا اور بخار میرے آغوش میں تھا۔ اور یہ کوئی نامحرم نہ تھا اور میرے بزرگ بخارا سے ہندوستان میں آئے تھے!

جب جسم مضبوط تھا تو ایک سال تک متھرا۔ بندرابن۔ گوکل۔ ہردوار۔ رشی کیش بنارس وغیرہ کی سیاحت میں اس طرح رہا تھا کہ ننگے پاؤں۔ ننگے سر ایک جھولی۔ ایک کمبل۔ ایک سونٹا پاس تھا۔ رات کو اینٹ پتھر سرہانے رکھ کر سوتا تھا۔

اب تکیہ بھی ریشمی۔ اس کے اندر روئی بھی سینبھل کی نرم۔ اور پہلو میں ایک نرم گدگدا تکیہ جس پر اپنی سوکھی ہڈی کا گھٹنا رکھتا ہوں۔ تب نیند آتی ہے۔

ریل میں پہلو کا تکیہ رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ اس طرح سُکڑ کر لیٹتا ہوں جیسے بانگڑی چڑیا۔

اب میرا جسم حضرت اکبر الہ آبادی سے بہت کچھ مشابہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ بھی سوتے تھے تو سُکڑ کر گٹھری بن جاتے تھے۔ میرا بڑا لڑکا حسین ابھی سے گٹھری بن کر سوتا ہے۔

سردی کے سبب کھڑکیاں بند تھیں اور ہر قسم کی بدبو میری طرف نیچے سے عروج کر کے آ رہی تھی۔

۲۲ شعبان ۱۳۵۰ھ ہفتہ ۲ جنوری ۱۹۳۲ء۔ دہلی

پھلواری شریف صبح ساڑھے پانچ بجے داناپور اسٹیشن پر اترا۔ خوب اندھیرا تھا۔ نماز پڑھ کر گھوڑا گاڑی میں سوار ہوا۔ پھلواری شریف پہنچا۔ اب بھی رات کی تاریکی دور نہ ہوئی تھی۔ حضرت مولانا سید شاہ بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر حاضر ہوا۔ روضے کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ تھوڑی دیر میں عبد الرزاق صاحب آ گئے جو مجھ کو جانتے تھے۔ ان کے ہمراہ خانقاہ کی مسجد میں گیا۔ جماعت ہو رہی تھی۔ نماز کے بعد حضرت سجادہ نشین مولانا سید محی الدین صاحب قادری چشتی سے دست بوسی کی۔ بالکل اپنے والد کی صورت ہو گئے ہیں۔ فنا فی الشیخ سنا تھا۔ یہ فنا فی الاَب (پدر) بھی ہیں۔ معانقے کے بعد مجھے کچھ دیر باہر انتظار کرنا پڑا۔ پھر حضرت نے عادت کے خلاف مجھ کو اندر حجرے میں بلا لیا۔ اس وقت وہ کسی سے نہیں ملتے۔ اندر جاتے ہی فرمایا۔ مسلمانوں کا کیا حال ہے؟

ان کو مسلمانوں کی موجودہ حالت نے بہت متاثر کر رکھا ہے۔ بزرگوں کے حکم کے بموجب مسجد اور حجرے کے سوا پھلواری کی آبادی میں بھی نہیں جا سکتے۔ گویا دنیا کی ہر زندگی سے الگ ہیں۔ یہی دستور ان کے بزرگوں کا تھا۔ اور گاندھی جی جب ان کے والد سے ملنے اس حجرے میں آئے تھے تو انھوں نے کہا تھا کہ اگر مجھ کو ہندوستان کا کام درپیش نہ ہوتا تو میں شاہ صاحب کی طرح ساری دنیا کو چھوڑ کر اسی طرح حجرے میں بیٹھ جاتا۔ شاہ صاحب کی جانماز کے دونوں طرف اخباروں کا انبار تھا۔ معلوم ہوتا ہے دنیا سے پوری طرح باخبر ہیں۔ بہت دیر تک کشمیری مسلمانوں کے حالات معلوم کرتے رہے۔ اپنے صاحبزادے کو بھی دکھایا جن کا نام امان اللہ ہے۔ سفید کی عمر۔ درویشی عمامہ باندھے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوتے تھے۔ ایک دوسرے بچے عون احمد بھی وہاں تھے۔ میں نے شاہ صاحب سے عرض کی کہ ان دونوں بچوں کے نام میں فقط ایک ایک نقطہ ہے۔ عون احمد اور امان اللہ!

دوسرا دروازہ حضرت اور خانقاہ شریف سے رخصت ہو کر دوسرے پیشوا کے دروازے پر گیا۔ حضرت مولانا قاری سید شاہ محمد سلیمان صاحب قادری چشتی درویشانہ انداز سے بیٹھے تھے۔ میں نے قدموں میں سر جھکایا۔ اسی برس کی عمر ہو گئی ہے۔ ناتوانی بہت زیادہ ہے۔ مجھ کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے ہیں۔ ایک پوتا گاؤ تکیے پر گھوڑا بنائے بیٹھا تھا۔ فیشن ایبل مشائخ کی طرح صفائی نہ تھی۔ سر علی امام بھی یہاں آتے ہیں تو اسی میلے بستر پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چاء کا لنگر جاری تھا۔ مسافر اور درویش حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ حضرت نے اسی نوازش کا برتاؤ کیا جو شروع سے آج تک

یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

از بھارت رتن ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند

تاریخ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک واقعی تاریخ جو بڑی تلاش و تحقیق۔ بڑی چھان بین کے بعد کتابوں میں لکھی جاتی ہے۔ اور ایک افسانوی تاریخ جو تخیل کے موقلم اور جذبات کے رنگوں سے عوام کے دلوں پر نقش ہوتی ہے۔ سلطنت مغلیہ میں بڑے بڑے عظیم الشان جلیل القدر اولو العزم بادشاہ گزرے ہیں جن میں سے ہر ایک اس عہد کی داستان کا رستم داستان کہا جا سکتا ہے۔ مگر افسانوی تاریخ میں ان میں سے صرف اکبر اور شاہجہاں نے جگہ پائی ہے۔ وہ بھی زیادہ تر اس لئے کہ اکبر نے محبت کے جادو سے اجیت راجپوتوں کو جیت لیا اور شاہجہاں نے عشق کی امر یادگار سنگ مرمر کے حسین پیکر میں تاج محل کے نام سے ڈھال دی۔ مگر عوام کا ہیرو ان میں سے کوئی نہیں۔ ان کے ستارے وہ ہیں جنہیں تاریخ کے آسمان پر چمکنا نصیب نہیں ہوا۔ جیسے ہمایوں جس نے نظام سقہ کو اپنی جان بچانے کے بدلے ڈھائی دن کی بادشاہت دے کر احسان شناسی کی روشن مثال قائم کی اور چتوڑ کی رانی کے ساتھ رکشا بندھن کے رشتہ کو نبھا کر بھائی بہن کی محبت کا سچا نمونہ دکھایا اور بہادر شاہ ظفر جس کی غزلیں سالہا سال تک اردو ہندی کے سارے علاقے میں مردوں اور عورتوں خاص کر خوش الحان فقیروں کی زبان سے فضا میں گونجیں اور سننے والوں کے دلوں کو تڑپاتی رہیں اور اب بھی جب سننے میں آجاتی ہیں پرانی چوٹوں کو ابھار دیتی ہیں۔

جو ہندوستان کے لوگوں کے مزاج اور مذاق کا محرم نہ ہو اسے تعجب ہوگا کہ آخر اس غریب بد نصیب مظلوم محروم بہادر شاہ میں کون سی ایسی بات تھی جس نے عوام کے تخیل کو چھیڑ دیا۔ اور ان کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس المناک شخصیت میں کئی ایسی خصوصیتیں تھیں جو ہندوستانیوں کے لئے ہمیشہ سے بڑی کشش رکھتی ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر سلطنت مغلیہ کا آفتاب لب بام تھا۔ ہندوستان کی طبعی آب و ہوا میں بھی اور ذہنی آب و ہوا میں بھی دوپہر کا سورج جس کی آب و تاب آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور جس کی تاب و تب ہڈیوں تک کو پگھلا دیتی ہے ان کے دلوں کو نہیں کھینچتا۔ مگر شام کے ڈوبتے ہوئے سورج کی نرم و نازک دھیرے دھیرے دھندلاتی ہوئی روشنی ان پر ایک عجیب روحانی کیفیت طاری کر دیتی ہے جس میں کچھ عبرت کچھ حسرت کچھ ذکر و فکر کی محویت کچھ دھیان گیان کی کیفیت ملی ہوئی ہوتی ہے۔ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کی زندگی میں بھی ان کی چشم تخیل کو غروب آفتاب کا یہی دلکش اور دلدوز منظر نظر آتا ہے۔

اگر آپ اس موہنی کا جو شبستان مغلیہ کی اس آخری شمع میں تھی اصل راز جاننا چاہتے ہیں تو ان کے حالات زندگی میں ان دل داریوں اور وضعداریوں کے واقعات پڑھیئے جن کی ایک مثال راشد الخیری نے لکھی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے آبا و اجداد میں ایک اور بد نصیب بادشاہ عالمگیر ثانی گزرا ہے۔ جسے اس کے نمک حرام وزیر نے قتل کر کے اس کی لاش جمنا کے کنارے جنگل میں پھنکوا دی تھی۔ اتفاق سے ایک برہمن عورت رام کور نے لاش کو دیکھا اور پہچانا اور رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی روتی رہی۔ اس محبت اور دلسوزی سے متاثر ہو کر عالمگیر کے بیٹے شاہ عالم نے رام کور کو اپنی منہ بولی بہن بنا لیا۔ اور وہ ہر سال سلونوں کے دن بادشاہ کے راکھی باندھنے لگی۔ اب یہ ایک وضع ہو گئی جسے شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی اور پھر بہادر شاہ نبھاتے رہے کہ رام کور کی اولاد میں سے ایک لڑکی بادشاہ کی بہن بن کر اس کے راکھی باندھا کرتی تھی۔ بہادر شاہ کے ذکر میں راشد الخیری نے اس تقریب کا سماں ان الفاظ میں باندھا ہے:-

"ادھر بادشاہ نماز سے فارغ ہوکر باہر آ بیٹھے
برہمنوں نے اسیس دی۔ درباریوں نے دعاؤں کے
نعرے بلند کئے اور قلعہ اس صدا سے گونج گیا —
"جہاں پناہ بادشاہ سلامت — آسمان پر گھٹا ٹوپ
اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔
لکھی باغ میں آموں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔
جامنوں کے گچھے ہوا میں جھوم رہے ہیں۔ زمین پر
گگرونداں کی بہار، آسمان پر بگلوں کی قطاریں دل کے
پار ہوتی جا رہی ہیں۔ پپیہا الاپ رہا ہے۔ کوئل کوک
رہی ہے۔ نقارے پر چوٹ پڑی نفیری بجی اور جھولے
میں جھولے والیاں گئیں۔ پینگیں بڑھ رہی ہیں۔
جھونٹے مل رہے ہیں۔ دوپہر تک جھولے اور پکوان
ہوتے رہے۔ کھانا کھایا اور بادشاہ سلامت نے اپنے
ہاتھ سے زمردیں چوڑیاں ایک ہاتھ میں پانچ ایک ہاتھ
میں تین اپنی منہ بولی بہن کے باندھیں اور ساتھ والیوں
کو جوڑے عطا ہوئے۔ نقد روپیے دیئے گئے۔ مٹھائیوں
کچوریوں پوریوں کے تھال ساتھ ہوئے۔ اس طرح
یہ بہن بھائی کے انعام اکرام سے مالامال رخصت ہوئی"۔

اس کے علاوہ ظفر کی ہر دلعزیزی میں بہت کچھ دخل اس
کی مقبول عام شاعری کو تھا۔ وہ نہ صرف سچا اور اچھا شاعر تھا بلکہ
اس کی شاعری درد دل کی شاعری تھی جو ہمارے یہاں بلکہ ساری
دنیا میں دل کے ان تاروں کو چھیڑتی ہے جو رشتہ جان کی حیثیت رکھتے
ہیں۔ یوں تو ظفر کے کلام میں خصوصاً ابتدائی کلام میں اس زمانے کے مذاق
کے مطابق "در ایام جوانی چنانکہ افتد دانی" کی شوخ اور رنگین تصویریں
بھی ہیں مگر اس کا اصل سرمایہ وہ متاع درد ہے جو اس نے ساری عمر
دکھ بھر کر رنج و مصیبت کی کڑیاں سہہ کر جمع کی اور پھر دلنشین اور
دلدوز شعروں کے سکوں میں ڈھال کر لٹا دی۔ اس نے
اسے عام کا محبوب شاعر بنا دیا اور اس کی غزلیں اور متفرق شعر
لوگوں کی زبانوں پر اس طرح چڑھ گئے کہ شاید نظیر اکبرآبادی کے سوا
کسی شاعر کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ ان غزلوں کو چھوڑ کر جو بچے
بچے کی زبان پر ہیں چند اور شعر نمونے کے طور پر آپ کو سناتا ہوں:۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

اور زیادہ بھڑکاتے ہو تم تو آگ محبت کی
سوزش دل کو اے اشکو کیا خاک "بجھا سکتے ہو

اے اسیران خانہ زنجیر
تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا

مر گئے آخر پھڑک کر دام سے چھوٹے نہ ہم
دل کی دل ہی میں تمنائے رہائی رہ گئی

گیا منزل پہ سارا قافلہ اور راہ غربت میں
ہم آواز جرس کی طرح سے تنہا بھٹکتے ہیں

آہ کب سینے سے اے ہم نفساں نکلے ہے
دل میں اک آگ سلگتی ہے دھواں نکلے ہے

ایک اور چیز جس نے ظفر کو مقبول و محبوب بنایا وہ یہ کہ وہ بظاہر
تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہو کر اور ملبوس شاہی زیب تن کر کے
بھی دل سے ایک خرقہ پوش بوریا نشین فقیر تھا۔ شاہی میں فقیری
کی ادا ہندوستانیوں کے دلوں کو اس طرح بھاتی ہے جیسے فقیری میں
شاہی کی آن بان۔ جوگ بیراگ یا ترک دنیا کی مذہبی عظمت تو اپنی جگہ پر
ہے لیکن اس روحانی رعب و جلال کے ساتھ ساتھ ہمارے
ملک کے لوگوں کو اس میں ایک رومانی حسن و جمال بھی نظر آتا ہے۔
اس شخص کے بارے میں جو تیمور، بابر، اکبر، شاہجہاں اور
اورنگ زیب کی جہانگیری اور جہانداری کی روایات کے
سائے میں بڑھا ہو، دولت و حشمت ناز و نعمت کی گود میں پلا ہو۔
جب یہ بات مشہور ہو کہ وہ مایا کے موہ کو چھوڑ کر سرچشمہ حقیقت سے
لو لگانا جانتا تھا۔ محراب عبادت میں سر جھکانے اور ماتھا رگڑنے
کے مزے سے واقف تھا نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی کی لذت سے

آشنا تھا تو کیا تعجب ہے کہ فقیر دوست ہندوستانی کیا ہندو کیا مسلمان اس کی یاد کو سینہ سے لگائے ہیں اور اس کا نام محبت اور عقیدت سے لیتے ہیں۔ ظفر کے کلام سے آپ حسرت و یاس درد و الم کی لے میں کچھ شعر سن چکے ہیں۔ چند اردو فارسی ہندی پنجابی شعر جوگ اور سادھنا۔ فقر و درویشی کی دھن میں بھی سنئے:—

اور تو چھوڑا یہاں کا سب یہاں
ایک تیرا داغ ہم لے کر چلے

نہ حرم میں تمہارا ہے یار پتہ نہ سراغ دیر میں ہے ملتا
کہاں جا کے دیکھوں میں جاؤں کدھر مرا چین گیا مری نیند گئی

انچہ بیرون و درون است ہماں آنجہاں
راز فاش ہمہ اوست نہاں ہمہ اوست

اس دنیا کے جتنے دھندے سگرے گورکھ دھندے ہیں
ان کے پھندے میں نہ پڑو تم ان میں نہ من الجھاؤ جی

کوئی کسی دا میت نہیں اپنے غرض دے میت
شوق رنگ اچھا کینا ہم نے کی نہ کسی سے پیت

ان سب باتوں کے علاوہ اور شاید ان سب سے بڑھ کر ایک اور بات ہے جس کی بدولت بہادر شاہ ظفر رومان کے ہالے کا چاند بن گئے اور وہ ان کی جنگ آزادی کے ہارے ہوئے ہیرو کی حیثیت ہے۔ شاید آپ تعجب سے کہیں یہ ہارا ہوا ہیرو کیا معنی۔ لیکن ملاحظہ پر غور اسا تو دیکھئے تو دنیا کی واقعی تاریخ اور افسانوی تاریخ میں آپ کو بے شمار ہارے ہوئے ہیرو نظر آئیں گے جن کا نام برسوں سے صدیوں سے محبت و عقیدت عزت و احترام اور فخر و مباہات کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق نیکی انصاف یا آزادی کی خاطر اپنے سے بڑی قوتوں سے اتنی بڑی قوتوں سے جن کے مقابلہ میں وہ کسی طرح فتح مند نہیں ہو سکتے تھے جنگ کی اور شکست کھائی مگر یہ مثال چھوڑ گئے کہ حق نے ناحق سے لڑتے ہوئے سر کٹا دیا مگر اس کے آگے سر نہیں جھکایا۔ اگر ان لوگوں میں عزم و ہمت اور شجاعت کا وہ جوہر جس سے ہیرو کا کردار بنتا ہے دنیا کے بڑے بڑے فاتحوں سے کم نہ تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انہیں عارضی شکست ہوئی۔ ہاں عارضی شکست اس لئے کہ قطعی اور دائمی شکست تو حق کی خاطر لڑنے والوں کو ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ قتل ہو جاتے ہیں اور ان کا خون بہہ کر خاک میں جذب ہو جاتا ہے لیکن اس خاک سے حق اور آزادی کے اور مجاہد نکلتے ہیں یہاں تک کہ حق کا بول بالا ہوتا ہے اور آزادی کا جھنڈا سر چڑھ کر لہراتا ہے۔

ہندوستانیوں کی نظر میں بہادر شاہ ظفر کے اندر جنگ آزادی کے ہیرو کی شان جن روایتوں نے پیدا کی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب ۸۲ سال کے بوڑھے بہادر شاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے گرفتار کر لیا اور سنگدل ہڈسن اس کے تین پیارے بیٹوں مرزا اسمٰعیل۔ ابوبکر اور خضر سلطان کے کٹے ہوئے سر ایک طشت میں رکھے ہوئے اس کے سامنے لایا اور بولا "لیجئے کمپنی کی نذر جو برسوں سے بند تھی پیش کی جاتی ہے"۔ تو بوڑھے بادشاہ کی جھکی ہوئی کمر تن گئی اور اس نے کہا "خدا کا شکر ہے۔ تیموری اولاد اس طرح سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی ہے"۔

یہ ہے وہ سلطنت مغلیہ کا ڈوبتا ہوا سورج۔ وہ دردِ دل کا شاعر۔ وہ بوریا نشین فقیر۔ وہ ہارا ہوا ہیرو جسے افسانوی تاریخ نے ہندوستانی عوام کے دلوں میں عزت و احترام کے تخت پر بٹھایا ہے۔ رومان کے جامے سے سجایا ہے اور محبت و عقیدت کے ہار پہنائے ہیں۔ یقین ہے کہ جب تک ہندوستانیوں کے دل میں وطن کی محبت اور آزادی کا جذبہ زندہ ہے وہ ظفر کی یاد کو زندہ رکھیں گے۔

یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

(مندرجہ بالا مضمون یوم ظفر کے موقعے پر لال قلعہ دلی کے دیوان عام میں پڑھا گیا)

تاثرات

حضرت ملا واحدی دہلوی

کسی شخص کے بچوں کا ایک دوسرے سے دل بگڑ جائے اور وہ شخص ہو حساس تو اُس کے لئے بچوں کا اختلاف مصیبت بن جاتا ہے۔ سگے بھائی بہن ہی نہیں، اللہ تعالےٰ تو کہتا ہے کہ تمام قرابت داروں کے ساتھ سلوک اور محبت سے رہا جائے۔ قرابت کے سلوک و محبت کو اللہ تعالےٰ نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعلیم دینِ حق کا معاوضہ قرار دیا ہے۔ اس سے زیادہ سلوک و محبت کی اہمیت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ارشاد ہے:۔ (اے محمدؐ) مسلمانوں سے کہو کہ میں (دینِ حق کی تعلیم کا) تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ الاّ یہ کہ قرابت داروں کے جو حقوق ہوتے ہیں وہ مت بھولو، آپس میں سلوک اور محبت سے رہو (قرابت داروں کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا بڑی نیکی ہے اور) جو شخص نیکی کرے گا۔ اس کی نیکی میں ہم مزید حُسن پیدا کر دیں گے (کسی قسم کا شُبہ نہ کرو) بلاشبہ اللہ (گناہوں کا) بخشنے والا (اور نیکیوں کی) قدر کرنے والا ہے۔ (سورہ ۴۲ آیت ۲۳)

بچوں کے اختلاف سے تڑپو نہیں، تڑپنے سے کیا حاصل ہوگا۔ یہ سوچو کہ اختلاف کی وجہ کیا ہے۔ سوچو گے تو تمہارا ہی قصور نکل آئیگا تم نے بچوں کی تربیت میں کچھ نہ کچھ کسر چھوڑی ہے۔ یا اپنا نمونہ اُن کے سامنے ایسا پیش کیا ہے جس کا اثر او رعکس آج دیکھ رہے ہو۔

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ ...... وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ۔ تم پر جو مصیبت آتی ہے تمہارے ہاتھوں آتی ہے۔ اللہ تو (تمہاری) بہت سی (لغزشوں اور غلطیوں کو) معاف (اور نظر انداز) کرتا رہتا ہے۔ اور (یہ اس کا فضل و کرم ہے ورنہ) تم (یہاں) دنیا میں (بھی) اُسے عاجز و مجبور نہیں کر سکتے (اب بھی اگر اس کی ہدایات کے مطابق زندگی گزارنے لگو تو اللہ مدد کو موجود ہے۔ یقین مانو) اللہ کے سوا تمہارا حقیقی مددگار دوسرا کوئی نہیں ہے۔ (سورہ ۴۲۔ آیات ۳۰ ۔ ۳۱)

اپنی غلطیوں کی تلافی کرو اور اللہ سے کہو ؎

اے نوح کی کشتی کے نگہبان بچالے
میری بھی ہے اک کشتی اُمید بھنور میں

امریکہ والے آج کل کوشش کر رہے ہیں کہ سمندر کے کھاری پانی سے میٹھا پانی نکالا جائے۔ جس طرح سمندر کی بھاپیں اُٹھنے سے بادل بنتے ہیں اور بادلوں سے میٹھا پانی برستا ہے۔ اسی طرح سمندر کا بہت سارا پانی کہیں روک کر غالباً بھاپیں اُٹھائی جائیں گی۔ اور بادل برسائے جائیں گے۔ ایسی کوششوں کی اسلام نے دعوت دی ہے اللہ کی ہر صنعت غور کرنے اور کام لینے کے لئے ہے۔ اللہ کی صنعتوں ہی سے اللہ کا پتہ لگتا ہے۔ اور نئی نئی ایجادوں کی تحریک ہوتی ہے۔ افسوس میں نے ابتدائے عمر اور طالب علمی کے زمانے میں یہ بات نہیں سمجھی، ورنہ سائنس ضرور پڑھتا۔ اور اسلام کی یہ دعوت قبول کرتا۔ ایجادوں کی وجہ سے موجدوں کا اِترا جانا اور بے آپے ہو جانا بُرا ہے اُنہیں سوچنا چاہیئے کہ وہ کھاری پانی سے میٹھا پانی تو نکال سکتے ہیں مگر کھاری پانی بہر حال اللہ ہی کے سمندر سے لینا پڑے گا۔ اور اللہ ہی کی بارش سے سیکھنا پڑے گا کہ کھاری کو میٹھا کیسے بنایا جائے۔ تمام ایجادوں کی بنیاد اللہ کی صنعتوں پر ہے۔ اس بنیاد کو نہیں بھولنا چاہیئے اور اس حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ انسان اللہ کی صنعتوں سے سبق لے سکتا ہے، اللہ کی صنعتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا رات کو دن سے اور دن کو رات سے نہیں بدل سکتا۔ ہوا کا رُخ نہیں پھیر سکتا۔ جہاز اور کشتیاں بنا سکتا ہے، اُن کے واسطے لکڑی اور لوہا نہیں پیدا کر سکتا۔

۱۹۶۰ء میں چرچا ہوا تھا کہ حکومت پاکستان نے محکمہ موسمیات کو حکم دیا ہے کہ مصنوعی بارش برسانے کا تجربہ کیا جائے۔ اچھی خبر تھی پتیلی سے بھاپیں اُٹھتی ہیں تو بڑے برتن سے بھاپیں کیوں نہ اُٹھیں گی

اور بھاپیں بادلوں کی شکل اختیار کرلیں تو تعجب کیا ہے لیکن اوّل تو ہر بادل برسا نہیں کرتا، دوسرے ہوا بالکل اللہ کے قبضے میں ہے۔ آپ نے مصنوعی بادل کو لاہور میں برسانا چاہا اور ہوا اُسے امرتسر لے اُڑی تو کیسی رہیگی یا ساتھ کے ساتھ طوفان بھی آگیا تو کیونکر نمٹئے گا۔

جس طرح قیامت کا وقوع فقط اللہ [illegible] ہے۔ اور یہ کہ فلاں انسان کل کیا کرسکے گا۔ اور کیا نہ کرسکے گا اور یہ کہ فلاں انسان کہاں مرے گا سب امور فقط اللہ جانتا ہے۔ انسان کو اپنے مستقبل اور اپنی موت کا علم نہیں دیا گیا ہے۔ اسی طرح اس کا علم کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی اور کھیتی یہاں برسے گی یا وہاں اس کا علم بھی اللہ کے ساتھ مختص ہے۔ آپ صرف ٹاپک ٹوئیے مار سکتے ہیں، جو کبھی ٹھیک نکلیں گے کبھی غلط۔

عکس ریز (X RAY) کے ذریعے بچے کا سر پیر، آنکھ، ناک تمام اعضا دیکھ لیجئے، مگر پیٹ میں بچے کی نشست اللہ تعالیٰ نے ایسی رکھی ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ علیٰ ہذا بادل شاید آپ کرلیں، لیکن اُنھیں مرضی کے مطابق برسانا محال ہے۔ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ج وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ط اس لئے کھاری پانی سے کسی اور طرح میٹھا پانی نکال کر نہریں ہی بہانی مناسب ہوں گی پانی برسانے کا خیال شاید ابھی قبل از وقت ہے۔

دو نشے تمام نشوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ ایک دولت کا نشہ دوسرے اقتدار کا نشہ۔ دولت کے اعتبار سے یا اقتدار کے اعتبار سے انسان ذرا سا اونچا ہو جاتا ہے تو پھر اُس سے اپنا آپا نہیں سنبھلتا افراد کے اور قوموں کے ظرف کو جانچنے کی کسوٹی میرے نزدیک صرف یہی ہے کہ دولت اور اقتدار کی اُس میں کتنی سہار ہے۔

جس کے پاس دولت و اقتدار ہے ہی نہیں اُس کی بابت کہا گیا ہے ؎

گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

غریب آدمی انکسار برتتا ہے اور لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا ہے تو کیا کمال کرتا ہے۔ تعریف کے مستحق حقیقتاً وہ دولت مند اور حاکم ہیں جو غریب آدمی کو آدمی سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملحوظ رکھتے ہیں کہ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى ط (بات اچھی اور بخش دینا بہتر ہے ان خیرات سے کہ پیچھے اس کے ہو ایذا) جن کی زبان سے اُن کے دست نگر اور ماتحت محفوظ رہتے ہیں ؎

گر بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی

دولت اور اقتدار حاصل ہو اور نشہ نہ چڑھے تو مردانگی یہ ہے۔

دولتمندوں اور حاکموں کا بے آپے پن دیکھ کر کہا جاتا ہے ؎

چہ گونہ شکر ایں نعمت گزارم
کہ زور مردم آزاری نہ دارم

ایسے دولتمندوں سے دور بھاگنے کا حکم ہے ؎

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

قدیم درویش صرف ان دولتمندوں اور حاکموں سے ملا کرتے تھے جو ان کے ہاں پہنچ جاتے تھے۔ وہ دولت مندوں اور حاکموں کے ہاں کے کاوے نہیں کاٹتے تھے۔ خدا معلوم حدیث رسولؐ ہے یا قول صحابہ کہ وہ امیر بہت اچھا جو درویش کے دروازے پر دکھائی دے اور وہ درویش بہت برا جو امیر کے دروازے پر نظر آئے۔ نِعْمَ الْأَمِيرُ عَلَى بَابِ الْفَقِيرِ وَبِئْسَ الْفَقِيرُ عَلَى بَابِ الْأَمِيرِ۔ اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان انبیاء اور اولیا کے سوا کسی کی بڑائی نہ ماننے والا اور إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔ دل سے کہنے والا دولتمندوں اور حاکموں کے گھر کا طواف کیسے کرسکتا ہے۔

سفرنامچہ

(منادی کے پچھلے پرچے میں میرے سفر احمد آباد اور بمبئی کی ایک تصویر خلاف معمول سفرنامچے کے بغیر چھپی تھی۔ اسے دیکھ کر منادی کے بعض قدردانوں نے تقاضا کیا کہ سفر کا حال بھی ہمیشہ کی طرح چھپنا چاہیئے۔ مگر گذارش یہ ہے کہ مصروفیت کی وجہ سے میں اس سفر کا حال تفصیل سے نہیں لکھ سکا تھا۔ اور اب جو کچھ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے وہ سفر کے تقریباً دوڈھائی مہینے بعد نوٹ بک کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ اسلئے ممکن ہے کہ آپ اسکو زیادہ دلچسپ نہ پائیں۔ تاہم احمد آباد کے بعض حالات اکثر ناظرین کے لئے غیر دلچسپ ہونے کے باوجود مفید ضرور ثابت ہوں گے۔
حسن ثانی نظامی)

۱۳ ستمبر۔ دلی سے روانگی

دلی سے بمبئی احمد آباد ہوتے ہوئے جاتا ہے۔ اور احمد آباد کا راستہ یادش بخیر اجمیر شریف ہو کر جاتا ہے سو یسے بھی ہم ایک لائن اور ایک صراط پر چلنے والے چشتی بہر صورت "بارگاہ احمد" اور "بارگاہ احمد" تک اجمیری خواجہ کے توسط ہی سے پہنچتے ہیں۔ اِدھر نیک نیتی کے ساتھ ٹکٹ لیکر اور بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا کہہ کر گاڑی میں قدم رکھا اور اپنے آپ کو انجن والے اور گارڈ کے سپرد کیا اور اُدھر منزل پر منزل طے ہوتی چلی گئی۔ ہر اسٹیشن پر عظیم الشان عملہ آسائش و آرام پہنچانے کے لئے موجود! راستے میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آجائے یا کوئی خود ہی چھلانگ لگا کر خودکشی پر آمادہ ہو تو دوسری بات ہے۔ ورنہ اسٹیشن ماسٹر تو ہر ایک پورے اہتمام اور سلامتی کے ساتھ مسافروں کو آگے بڑھا دیتا ہے۔ اور منزل مقصود پر پہنچانے میں کسر نہیں رکھتا۔

صبح سویرے دلی اکسپرس سے روانگی ہوئی۔ ہندو اور سکھ فوجی رفیق سفر ہیں۔ اور سب بڑے خوش مزاج اور فقیر دوست ہیں۔ ہنستے بولتے وقت کٹ رہا ہے۔ بعد دوپہر گاڑی جے پور سے گزری تو یہاں کے محبان خاص سید احمد علی شاہ صاحب جعفری سابق وقف کمشنر اور سید مصباح الرحمٰن صاحب فرزند اکبر حضرت بسمل جے پوری اور حضرت زیب دہلوی بے اختیار یاد آگئے۔ جے پور میں حضرت مولانا فخر صاحب کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا ضیاء الدین نظامی فخری آرام فرما ہیں۔ ان کی خدمت میں دور سے ہدیہ فاتحہ وسلام پیش کیا۔

عشاء کے وقت اجمیر آیا۔ نگاہیں بارگاہ خواجہ میں زمین بوسی سے ہنوز فیض یاب نہ ہوئی تھیں کہ پلیٹ فارم پر آستانہ عالیہ کے صاحبزادگانِ ذی شان حضرت سید فضل احمد صاحب چشتی اور حضرت سید ایوب صاحب چشتی اور حضرت سید عظیم الدین صاحب چشتی اور ثروت صاحب اور محمد نور صاحب وغیرہ گل بکف نظر آئے۔ اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

ایک طرف صاحبزادہ عظیم الدین صاحب نے اجمیری چنبیلی کے پھول پہنائے اور دوسری طرف صاحبزادہ ایوب صاحب نے نہایت لحیم شحیم توشے دان کھول کر خواجہؒ کا دسترخوان آراستہ کر دیا۔ اس لنگر میں ہندو رفیقان سفر بھی حسن اعتقاد کے ساتھ شریک ہوئے۔

صاحبزادہ فضل احمد صاحب حضرت محبوب پاک کے عرس پر دلی تشریف لائے تھے تو ان کے سامنے بمبئی کے سفر کا سرسری ذکر آیا تھا۔ جسے انھوں نے مسافر نوازی کا بہانہ بنا لیا اور غریب نوازؒ سے اپنی نسبت کو پوری طرح ظاہر کر دیا۔

حضرت محبوب پاک کو ان کے پیر حضرت بابا فرید گنج شکرؒ

نے دعا دی تھی کہ

"اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا درخت بنائے جس کے سایہ
میں مخلوق خدا آرام پائے"

لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ دعا ہمارے سلسلۂ عالیہ کے ہر جانشین کو اپنے اپنے ولی النعمت اور مربی سے ہمیشہ ملتی رہی ہے۔ اور اللہ نے اسے شرف قبولیت بھی عطا فرمایا ہے۔ کیونکہ اپنے پیر سے لے کر سرکار رسالت مآب تک سلسلے کے ہر بزرگ کا وجود ہمارے لئے ایک سایہ دار اور سکون بخش منزل گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں راستے کی صعوبتوں کے بعد قافلہ جان کو کسی نہ کسی بہانے دو گھڑی ہر طرح کا آرام مل جاتا ہے۔ اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ایک نئی توفیق اور نئی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے خواجہ غریب نواز کے خدام عالی مقام نے مجھے سرفراز فرمایا تو یہ گویا میرا ایک مقررہ اور خداداد حق تھا جو عطا کیا گیا۔

ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا!

میں بمبئی برادر روحانی علی محمد نظامی کی لڑکی کی شادی میں جا رہا ہوں۔ اور احمد آباد کا راستہ اسلئے اختیار کیا ہے کہ وہاں کے بزرگوں کی زیارت ہو جائے۔ بمبئی کی شادی کا دعوت نامہ آج ہی صاحبزادہ فضل احمد صاحب کو بھی ملا۔ اور انھوں نے بھی پروگرام بنا لیا۔ چنانچہ میرے ساتھ ہی تشریف لے جا رہے ہیں۔

۴ ار ستمبر } رات کو سوتے وقت ہماری ٹرین ریگستان کے آغوش میں تھی۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ آبو کے اونچے پہاڑوں پر دوڑ رہی ہے۔ موسم بھی ایک دم بدل گیا تھا۔ اور خاصی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ نیچے نیچے بادل پہاڑ کی اونچی چوٹیوں کو گویا سلامی دیتے ہوئے گزر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں پالن پور آ گیا۔ جو پہلے ایک ریاست کی حیثیت رکھتا تھا اور اب متحدہ ہندوستان کا ایک حصہ ہے بڑی صاف ستھری اور پر فضا جگہ ہے۔ ہر ہائی نس بیگم صاحبہ پالن پور۔ منادی کی قدردان ہیں۔ اور بھی بہت سے جاننے والے اور پیر بھائی اس علاقہ میں ہیں۔ مگر میں اس راستے سے پہلی دفعہ گزر رہا ہوں۔

پالن پور کے بعد اونجھا اسٹیشن آیا تو ایک زرد ٹوپی والے صاحب کو دیکھا کہ ہر کمپارٹمنٹ میں جھانک کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ میں سمجھا کہ شائد ان کو جگہ کی تلاش ہے لیکن جب میری کھڑکی کے پاس پہنچے تو انھوں نے خوشی میں "یہاں ہیں!" اور میں نے حیرت زدہ ہو کر "آپ کہاں؟" کا نعرہ لگایا۔ یہ وکیل بھائی رسول بھائی نظامی تھے جو حضرت مولانا شاغل نظامی کے مرید ہیں۔ پہلے اسمبلی کے ممبر تھے۔ آج کل درگاہ حضرت میراں داتار کے ٹرسٹی ہیں۔ ان کے ساتھ درگاہ شریف کے سجادہ نشین حضرت ظہور میاں محمد میاں

وغیرہ متعدد حضرات تھے۔ سب نے پھول پہنائے۔ سجادہ نشین صاحب نے تبرک عطا فرمایا اور درگاہ شریف چلنے کی دعوت دی جو اونجھا سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ میرا بھی درگاہ شریف میں حاضری کو بہت جی چاہا اور خاص طور پر یہ معلوم کر کے تو طبیعت بڑی بے چین ہوئی کہ گجرات کی عظمت رفتہ کی یادگار شہر پٹن بھی یہاں سے قریب ہی ہے۔ جہاں حضرت محبوب الٰہی کے برگزیدہ خلفاء حضرت مولانا حسام الدین ملتانی وغیرہ آرام فرما ہیں۔ لیکن آج ہی شام کو احمد آباد سے بمبئی روانہ ہو جانا ہے۔ اس لئے بادل ناخواستہ اس دعوت سے محروم رہنا پڑا۔

اپنے اس سفر کی اطلاع میں نے احمد آباد میں صرف بھائی حسن الدین نظامی اور عبدالکریم نظامی کو دی تھی۔ کیونکہ محض چند گھنٹے ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ مگر

پیراں نمی پرند مریداں می پرانند

کے مطابق بھائی حسن الدین نظامی نے کلول میں مولانا شاغل نظامی کو اطلاع دے دی۔ اور مولانا شاغل سے اونجھا اور درگاہ حضرت میراں داتار تک خبر پہنچ گئی اور یہ سب حضرات صبح صبح زحمت فرما کر میرے استقبال کے لئے آ گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

سجادہ نشین صاحب اور دیگر متعلقین اونجھا پر مل کر رخصت ہو گئے۔ لیکن وکیل بھائی نظامی احمد آباد تک ساتھ دینے کے لئے ٹھہر گئے رسالہ دین دنیا کے بعض پرانے پرچے بھی انھوں نے تحفے میں دیئے جن میں حضرت خواجہ صاحب کا ۱۹۲۱ء کا روزنامچہ ہے۔ وکیل صاحب اس علاقے میں اپنی قومی خدمات کی وجہ سے بڑے مقبول معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ تقریباً ہر اسٹیشن پر ان کے جاننے والے نظر آتے تھے اور بڑے احترام کے ساتھ سلام دعا ہوتی تھی۔

کلول اسٹیشن پر حضرت شاغل نظامی صاحب اپنے صاحبزادوں اور خلفاء اور مریدوں کے قافلے کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ یہاں بھی حسب معمول خوب پھول پہنائے گئے اور دودھ کے شربت کا لنگر جاری ہوا۔ مولانا شاغل نظامی صاحب ایک مرشد کامل کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔ اور میر جہانگیر لائبریری کے نام سے انہوں نے کلول میں ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری قائم کی ہے۔ اور اردو کی ترویج و ترقی میں بھی بڑے جوش و خروش اور لگن سے شریک رہتے ہیں۔ ہندوستان کے مشائخ میں ایسا علمی اور ادبی مذاق اب بہت کم ہوتا جاتا ہے۔ اس علاقے میں موصوف کے ذریعے سلسلۂ نظامیہ کا فیض خوب پھیل رہا ہے۔ اور ہندو مسلمان سب ان سے اعتقاد رکھتے ہیں۔

کہنے کو میں دلی سے اکیلا چلا تھا لیکن نظامیت کی نسبت کے ہوتے ہوئے آدمی کہیں بھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اجمیر شریف سے حضرت صاحبزادہ فضل احمد صاحب چشتی ساتھ ہوئے تھے۔ اوجھا سے وکیل بھائی نظامی اور اب کلول سے حضرت مولانا شاغل نظامی اپنے مریدوں کی ایک جماعت کو لے کر شریک ہو گئے۔ اور ایک پورا نظامی قافلہ بن گیا۔ سبحان اللہ۔ یہ رشتہ بھی کیسا اچھا رشتہ ہے کہ جو اس میں منسلک ہو گیا اس کو ازل سے ابد تک کا ایک ساتھ اور ایک تعلق میسر آ گیا۔ اللہ اسے بنائے رکھے۔

رشتۂ پیر مغانم نازل در گوش است
ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

کلول سے روانہ ہونے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد گاڑی احمد آباد پہنچ گئی۔ بھائی حسن الدین نظامی۔ مولانا سید محمد حسین الفت شاہ صاحب حیدر آبادی۔ محمد میاں صاحب برادر خواجہ لال نظامی سیٹھ عبدالرزاق ولی اللہ صاحب۔ چھوٹو بھائی مرادی نظامی سیٹھ غلام محمد ہوا۔ سید رشید احمد صاحب ابن قربتی شاہ نظامی فرزند ماسٹر نجم الدین نظامی۔ سراج الدین صاحب۔ قاسم میاں صاحب۔ محمد میاں صاحب ابن سیٹھ احمد ولی اللہ۔ نصر اللہ خاں بن محمد خاں روشن دل نظامی۔ علی میاں قطب الدین نظامی وغیرہ احباب کے مجمع نے پھولوں اور مصافحوں سے استقبال کیا۔

میں پہلی دفعہ احمد آباد آیا ہوں۔ دنیا کے شاید کسی ایک شہر میں ہمارے شجرۂ نظامیہ نصیریہ کے اتنے بزرگ آرام فرما نہیں ہیں جتنے احمد آباد میں ہیں۔ احمد آباد پیر بھی نظامی مرحوم کا شہر بھی ہے۔ جن کی خاطر حضرت خواجہ صاحب مرحوم بار بار یہاں آیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اس کی زیارت کا ایک عرصے سے اشتیاق تھا جو آج پورا ہوا۔

بھائی حسن الدین نظامی صاحب نے میرا میزبان سیٹھ عبدالرزاق صاحب کو بنایا ہے۔ جو یہاں کے مشہور ولی اللہ خاندان کے معزز رکن ہیں۔ سیٹھ غلام محمد ہوا اپنی صبا رفتار موٹر میں ان کے گھر لے گئے۔ راستے کے ساتھیوں میں سے صرف حضرت صاحبزادہ فضل احمد صاحب چشتی کی رفاقت میسر رہی۔ بقیہ حضرات رخصت ہوئے۔

سیٹھ عبدالرزاق صاحب کا مہمان خانہ بڑا خوبصورت آرام دہ اور شاندار ہے۔ بھائی حسن الدین نظامی ان کے ساتھی اور پڑوسی ہیں۔ پریمی صاحب مرحوم کا مکان بھی اسی محلّے پانچ پٹی میں چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کو دور سے دیکھا۔ اس میں کچھ سندھی آباد ہیں۔ یہ مکان بڑے عظیم الشان دینی کارناموں کا مرکز رہ چکا ہے۔ اس کے علاوہ پریمی صاحب مرحوم کی یاد اس سے ایسی وابستہ ہے کہ مجھ جیسے جذباتی آدمی کو قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

سامان عبدالرزاق صاحب کے ہاں چھوڑ کر سب چھوٹو بھائی مرادی نظامی کے ہاں پہنچے۔ مرادی نظامی قدیم پیر بھائیوں کے "باقیات الصالحات" میں سے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے اکثر پیر بھائی قبرستان یا پاکستان جا چکے ہیں۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ جو چند صورتیں نظر آ جاتی ہیں ان کا دم بھی بڑا غنیمت ہے۔ مرادی نظامی کے عزیز و اقربا اور گھر والوں نے بڑی محبت سے خاطر تواضع کی۔ اور رومال اور تسبیح وغیرہ کے وہ تحائف بھی دیئے جو میرے لئے بطور خاص مکّے سے لے کر آئے تھے۔ اور امانت رکھ چھوڑے تھے کہ یہ لوگ دلی جائیں یا میں احمد آباد آؤں تو پہنچائیں۔ اللہ جزائے خیر دے۔

مرادی نظامی کے ہاں سے واپس ہوتے ہوتے جمعے کا وقت ہو گیا تھا۔ پانچ پٹی کی "مرمریں مسجد" میں نماز پڑھی جو عبدالرزاق صاحب کے بزرگ سیٹھ ولی اللہ صاحب کی بنوائی ہوئی ہے۔ چھوٹی سی مسجد ہے مگر خوبصورت اور صاف ستھری ہے۔

جمعے کے بعد بھائی حسن الدین نظامی کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ چھوٹو بھائی مرادی نظامی۔ سیٹھ محمد عمر ہوا ڈائرکٹر گجرات پیر ملز۔

حافظ محمد عمر نیازی صاحب ڈائرکٹر دہلی اسٹیٹ وقف بورڈ ممبر سیٹھ عبدالرزاق ولی اللہ جلدے کے علی میاں ، سوداگر سیٹھ مکند لال صاحب، عبداللہ میاں صاحب مالک ہوزری فیکٹری سیٹھ قاسم میاں ولی اللہ، محمد میاں ولی اللہ سیٹھ غلام محمد صاحب ہوا۔ کریم بھائی نظامی، ملکاپور کے صوفی صاحب رشید احمد ابن قریشی شاہ نظامی وغیرہ بہت سے احباب اور پیر بھائی شریک طعام رہے۔ حافظ محمد عمر صاحب کے لطیفوں سے دسترخوان زعفران زار بنا رہا۔ انھوں نے بڑی پر مذاق طبیعت پائی ہے۔ بھائی حسن الدین کے سب گھر والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔

کھانے کے بعد اصل کام شروع ہوا یعنی زیارتیں۔ سیٹھ عبدالرزاق صاحب نے اپنی موٹر عنایت کردی جس کی وجہ سے تھوڑے وقت میں سب جگہ حاضری ہوگئی۔

سب سے پہلے حضرت سلطان المشائخ کے مشہور مرید حضرت موسیٰ سہاگ کے مزار پر حاضر ہوا جن سے سدا سہاگ فقراء کا سلسلہ جاری ہے۔ حقیقت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مولانا موسیٰ ایک روز حضرت محبوب پاک کے پاس عورتوں کا لباس اور چوڑیاں پہن کر پہنچے تو حضرت نے انھیں اس عجیب وضع میں دیکھ کر پوچھا کہ آج عورت بن کر کیوں آئے ہو۔ مولانا موسیٰ نے عرض کی کہ آج میں نے ایک ہندو عورت کو اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلتے ہوئے اور ستی ہوتے ہوئے دیکھا تو بہت متاثر ہوا کہ ایک عورت اپنے شوہر کی ایسی وفادار ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ زندہ جل مرتی ہے۔ مگر افسوس کہ ہم مرد ہوتے ہوئے اپنے مالک حقیقی اللہ تعالےٰ کے وفادار نہیں رہتے۔ اس لئے میں نے زنانہ لباس پہن کر آج سے اللہ تعالےٰ کا سہاگ اختیار کیا ہے۔

حضرت محبوب پاک نے یہ سن کر فرمایا کہ تم نے بزعم خود اللہ تعالےٰ کا سہاگ تو اختیار کر لیا لیکن اللہ تعالےٰ کو تو کبھی موت نہیں آئے گی جو تم ستی ہوسکو! پھر اس سے کیا فائدہ؟ بہرحال چونکہ تم نے ذوق و شوق اور محبت کے جذبے میں یہ کام کیا ہے اس لئے میں منع نہیں کرتا۔ جاؤ اس لباس کو شہرت اور رسوائی کا ذریعہ نہ بنانا!

ایک اودھی درویش سائیں مسکین شاہ حضرت موسیٰ سہاگ کے مزار کی مجاورت کرتے ہیں۔ مردانہ لباس میں تھے۔ البتہ کانوں میں بندے اور ہاتھوں میں چوڑیاں سدا سہاگ فقراء کے طریقے کے موافق پہن رکھی تھیں۔ مزار شریف پر بھی جگہ جگہ لوگوں نے چوڑیاں رکھ چھوڑی تھیں۔

اللہ تعالےٰ نے آدمی کو بھی کیسا طلسماتی بنایا ہے کہ جہاں دم لینے کو پل بھر ٹھیرتا ہے وہیں آسودگی خاطر کے لئے ایک جہانِ دیگر تعمیر کر لیتا ہے۔ اور اس کی اکثر نوبت میں منزل حقیقی کے جمالی مزے لوٹنے چاہتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

اللہ تعالےٰ ان پناہ گاہوں میں کسی کو گم نہ ہونے دے اور آخری ٹھکانے تک بخیر و عافیت پہنچا دے۔ اور وہ حشر نہ ہو کہ

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں!

سائیں مسکین شاہ صاحب نے چائے سے خاطر کی۔ ان کے حجرے میں تصوف کی کچھ کتابیں رکھی نظر آئیں جس سے معلوم ہوا کہ یہ محض رسمی فقیر نہیں ہیں اور گفتگو سے بھی اندازہ ہوا کہ

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

ویسے بھی حضرت موسیٰ کے مزار پر محبوب الٰہی کی قوی نسبت اور فرمان خاص ("درمیانِ ہر عامی خاصی ہست"! ۔ عوام کے ہر مجمع میں کوئی خاص بھی ہوتا ہے) کے تحت کسی نہ کسی شکل میں موجود رہنا ضروری ہے۔

مزار شریف پر ایک خاص کیفیت ہے۔ اطراف میں دور دور تک قبرستان پھیلا ہوا ہے۔ غلام نظام الدین پرمی نظامی ایڈیٹر دین اور بعض دوسرے پیر بھائی اسی قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کی قبروں پر بھی فاتحہ پڑھی۔ برسات کی وجہ سے ہر جگہ اونچی اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ بھائی حسن الدین وغیرہ ساتھ نہ ہوتے تو ان مزاروں تک پہنچنا بھی مشکل تھا۔ شائد وقف بورڈ کے تحت یہاں کا انتظام ہے۔ اور بہت برا انتظام ہے۔ یہ دیکھ کر بھی بہت تکلیف ہوئی کہ گجرات کے محسن پرمی مرحوم کی قبر پر کوئی کتبہ تک نہیں ہے۔ بے نشان ہونا پریم و محبت کی رسم سہی لیکن اس احسان فراموشی کو کیا کہئے کہ جس نے ساری زندگی قوم کی خدمت میں وقف رکھی قوم کی خاطر جیلوں میں چکیاں پیسیں اور تمام عمر قوم کی دردمندی میں گزار گیا۔ قوم کو اتنی

توفیق بھی نہیں ہوئی کہ اس کی قبر پر چند اینٹ کا ایک کتبہ لگا دے۔ یہ فروگزاشت گجرات اور خاص طور پر احمد آباد کے مسلمانوں کے لئے کچھ نیک نامی کا باعث نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ سہاگ کے بعد حضرت جمال الدین جن کے مزار پر حاضر ہوا۔ جو حضرت شیخ یحییٰ مدنی کے پردادا پیر تھے۔ نظامیہ نصیریہ سلسلے میں حضرت چراغ دہلی کے بعد ان کا پانچواں واسطہ ہے۔ پرانے شہر سے باہر دریائے سابرمتی کے دوسرے کنارے پر حضرت کی درگاہ ہے۔ یہ علاقہ اب نئے شہر کے دیہات میں آگیا ہے۔ حضرت جمال کا مزار بہت بڑا بنا ہوا ہے۔ غلاف شریف پر حضرت شاہ نیاز وغیرہ کے اشعار کڑھے ہوئے تھے۔ جن میں سے اکثر غلط لکھے گئے تھے۔ ایک شعر خود حضرت کا بھی تھا۔

چوں بدریائے جمالش غوطہ خورد
دید جز تن دنیا و عقبیٰ یکیست

حضرت کا یہ شعر پڑھ کر مجھے غالب کا ایک شعر یاد آگیا۔

لاف، دانش غلط و نفع عبادت معلوم!
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں!

مگر اس قسم کے اشعار لکھتے ہوئے اور پڑھتے ہوئے آج کل ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ زمانہ دو ضرب دو مساوی چار کا ہے۔ حساب کے فارمولے سے ہٹتے ہی گمراہ ہونے والوں کا ایک لشکر تیار ہو جاتا ہے اور شیخ جی الگ فتوؤں کے گرز سنبھال کر دوڑ پڑتے ہیں۔ بقول حضرت اکبر جن کو کبھی حسن سے کام نہ رہا ہو وہ دریائے جمال کی غوطہ زنی کو سمجھ بھی کیا سکتا ہے۔

مزار شریف پر نہایت اطمینان سے فاتحہ پڑھی اور جن کا اسم مبارک روز شجرہ خوانی کے وقت زبان سے ادا ہوتا اور کانوں میں پڑتا رہتا تھا۔ ان کے مزار کی دید سے آنکھیں بھی ٹھنڈی ہوئیں اور چشم و گوش کی آشتی اس رنگ میں بھی میسر آئی۔

حضرت جمال الدین کی درگاہ شریف سے ہمارا قافلہ ان کے خلیفہ حضرت حسن محمد صاحب قبلہ کی درگاہ میں پہنچا۔ یہاں کئی بزرگ مدفون ہیں۔ اور سب کے مزارات برابر برابر ہیں۔ روضے کی تعمیر کا انداز کچھ ایسا ہے کہ زائر کو پوری طرح سیری نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان سب مزاروں میں قبلہ رخ پہلو صرف ایک مزار ہی کا میسر آتا ہے قریب ہی مسجد ہے۔ عصر کی نماز جماعت سے پڑھی۔ گنتی کے چند آدمی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں زائرین کی آمد و رفت کچھ کم ہے۔

ایک بڑی کام کی چیز یہ نظر آئی کہ یہاں مدفون ہونے والے بزرگوں کے نام اور وفات کے سنہ ایک طرف لکھے ہوئے تھے۔

حضرت خواجہ شیخ احمد کبیر میاں جی چشتی سنہ ۹۶۲ھ
حضرت خواجہ شیخ حسن محمد قطب الاولیاء چشتی سنہ ۹۸۲ھ
حضرت خواجہ شیخ محمد قطب الاقطاب چشتی سنہ ۱۰۴۰ھ
حضرت شیخ محمد عاشق میاں چشتی سنہ ۱۱۲۰ھ

حال کے بزرگوں اور سجادہ نشینوں میں حضرت شیخ ثانی فریدالدین چشتی متوفی سنہ ۱۳۳۶ھ اور حضرت خواجہ شیخ قبلہ محمود میاں چشتی متوفی سنہ ۱۳۱۱ھ کے اسماء درج ہیں۔

درگاہ شریف کے دروازے پر حضرت نصیر میاں صاحب چشتی سجادہ نشین کے بھائی مولانا حسن میاں صاحب کا مکان ہے۔ وہ بیمار تھے لیکن میری خبر سن کر فوراً باہر تشریف لے آئے۔ اور بڑی محبت سے ملے۔ انھوں نے فرمایا کہ تمہارے والد اپنے ابتدائی زمانے میں اسی مکان میں ٹھیرا کرتے تھے۔ اس لئے تم کو بھی ان کی سنت پر عمل کرنا چاہیئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ کہیں بھی ٹھیریں در اپنے بزرگوں ہی کا ہوتا ہے۔ اس در کے علاوہ نہ کہیں ہمارا گزر ہے نہ ٹھکانہ۔

احمد آباد شہر سے باہر ایک مقام سرکھیج نامی ہے۔ غالباً سرخیز یا زرخیز نام ہوگا۔ بعد میں بگڑ گیا۔ یہاں کے گلاب مشہور ہیں۔ نظامیہ سلسلے کے کئی بزرگوں کی درگاہیں یہاں ہیں۔ سلطان محمود بیگڑا نے حضرت احمد کے مزار پر جن کے نام سے یہ شہر موسوم ہے۔ ایک نہایت عالیشان مقبرہ بنوایا ہے۔ اور اس سے متعلق ایک عظیم الشان مسجد اور دیگر عمارتیں ہیں۔ یہاں زائرین کی بہت چہل پہل نظر آتی۔ درگاہ شریف کے پہلو میں ایک بڑا تالاب ہے۔ سلطان محمود بیگڑا کا مقبرہ بھی قریب ہی ہے۔ فن تعمیر کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ ہندو طرز تعمیر غالب ہے۔ کچھ فاصلے پر حضرت علی شیر کی درگاہ ہے جن کو سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کا خلیفہ بتایا جاتا ہے۔ مزار شریف کے قریب بچوں کی زرکار ٹوپیاں اور لکڑی کے کھلونے بکثرت رکھے ہوئے تھے معلوم ہوا کہ یہاں اولاد کے لئے منت مانی جاتی ہے۔ اور منت پوری ہونے کے بعد لوگ یہ چیزیں چڑھاتے ہیں۔

تیاریوں سے فارغ ہوتے ہوتے مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ احمد آباد کی مسجدوں کی ہمیشہ سے تعریف سنی تھی۔ اس لئے جی چاہا کہ مغرب کی نماز جامع مسجد میں پڑھی جائے۔ مگر وہاں جا کر طبیعت کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئی۔ شہر کے وسط میں ہونے کے باوجود نمازی توقع سے بہت کم تھے۔ مسجد کا مسقف حصہ نہایت تاریک ہے۔ اور ہر طرف کہنگی اور خستگی کے آثار نمایاں ہیں۔ تعمیر کا طرز اور اس میں جو پتھر استعمال ہوا ہے اس کا رنگ ایسا ہے کہ وسعت کے باوجود روشنی اور زندگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ ایک بڑی عجیب چیز یہ نظر آئی کہ ستونوں کی قطاروں میں ایک قطار چھوڑ کر ہر دوسری قطار ایسی ہے کہ اس میں ستون کے سامنے سجدہ بڑی مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اور صف بندی میں رخنہ پڑتا ہے۔ یہ طرز تعمیر کی خرابی ہے۔ مسجد کا صحن بہت کشادہ ہے اور وضو وغیرہ کا انتظام نہایت معقول۔

جامع مسجد سے واپسی میں کچھ دیر بھائی حسن الدین کے ایک دوست کی دوکان پر بیٹھنا ہوا۔ بڑی محبت سے ملے۔ حسن الدین صاحب کے چھوٹے بھائی کی دوکان پر بھی ٹھیرا۔ یہ سب لوگ کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں۔

رات کا کھانا اپنے میزبان سیٹھ عبدالرزاق صاحب کے جگمگاتے ہوئے حجرۂ مرمریں میں کھایا۔ احمد آباد میں اندر سے تو مکانات بڑے صاف ستھرے اور سجے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن باہر کی صفائی کا اہتمام کم کیا جاتا ہے۔ بمبئی میں بھی میں نے دیکھا کہ فلیٹوں میں رہنے والے گھر کا کوڑا کرکٹ اور گندگی بلا تکلف گلی میں پھینک دیتے ہیں۔ اور احمد آباد میں بھی یہ چیز نظر آئی کہ نہایت صاف ستھرے اور خوبصورت گھروں کے دروازوں پر گھر کا کوڑا اور باورچی خانے کی چھوٹن پڑی رہتی ہے۔ خاص طور پر پیاز کے چھلکے تو ہر جگہ نظر آئے۔ سیٹھ عبدالرزاق صاحب نے جس کمرے میں کھانا کھلایا وہ ان کے مہمان خانے کی طرح بڑا آراستہ پیراستہ اور سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ حالانکہ باہر سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالےٰ سب مسلمانوں کے باطن کو ایسا ہی خوش نما اور آراستہ کر دے۔ آمین۔

بہت سے احباب کا کھانے میں ساتھ رہا۔ سیٹھ غلام محمد ہوا اور سیٹھ محمد عمر ہوا ڈائرکٹر گجرات پیپر ملز کے دلچسپ خاندانی نام ہوا پر میں غور کرتا رہا کہ پیپر کے ساتھ اس نام کی بڑی دلچسپ مناسبت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیپر کے بغیر آج کل کسی کا جینا مشکل ہے۔ اڑنے والے ہر طرح اڑتے بھی پیپر ہی کے سہارے ہیں۔ اور دوسروں کو اڑانے میں بھی پیپر سے بڑی مدد لی جاتی ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا لطیفہ مشہور ہے کہ ہوائی جہاز نئے نئے چلنے شروع ہوئے تھے۔ ایک جہاز ان کے مکان پر سے گزرا تو حضرت خواجہ صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے۔ حضرت اکبر ان کا ہاتھ پکڑ کر فوراً باہر آئے اور جہاز کو اڑتا دیکھتے رہے جب وہ چلا گیا تو خواجہ صاحب سے بولے کہ

"خواجہ صاحب آپ نے اس گورے کو دیکھا جو جہاز چلا رہا تھا؟"

خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ "مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا۔"

حضرت اکبر نے کہا "نہیں اس میں ایک گورا بیٹھا تھا۔ اور مجھ سے کہتا تھا دیکھ اکبر! ہم اڑتے ہیں!"

خواجہ صاحب نے ہنس کر پوچھا "پھر آپ نے اس کو کیا جواب دیا؟"

حضرت اکبر نے کہا میں نے اس سے کہہ دیا:۔

"خدا تمہیں اڑائے!"

اسی طرح پیپر اس معنیٰ میں بھی لوگوں کو اڑاتا ہے کہ وہ ترقی کرتے ہیں۔ اور اس معنیٰ میں بھی اڑاتا ہے کہ پیپر کے ذریعے لوگ غارت ہو جاتے ہیں۔ اور اخباروں میں افواہوں اور پروپگنڈے کی جو "ہوائیاں" اڑتی ہیں۔ وہ بھی پیپر ہی کی محتاج رہتی ہیں۔ اس لئے پیپر بنانے والے کا نام ہوا ہے تو خوب ہے۔ اور بڑا مناسب ہے۔

کھانے کے بعد بمبئی جانے کے لئے اسٹیشن آیا۔ صبح دلی کی گاڑی میں قرآن شریف کا ایک پیکیٹ بھول گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ گم شدہ مال کے محکمے سے مل گیا۔ البتہ اپنی لاپروائی کا کچھ جرمانہ دینا پڑا۔ جس کو میزبان نے ادا کیا۔

ملئیں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

۲۴ ستمبر — علی الصبح گاڑی بمبئی پہنچ گئی۔ بارش ہو رہی تھی۔ بھائی احمد نظامی۔ سیٹھ علی محمد نظامی۔ میاں یوسف نظامی اور بھائی عبدالکریم نظامی نے پھولوں سے استقبال کیا۔ حضرت صاحبزادہ فضل احمد صاحب چشتی دوسرے کمپارٹمنٹ میں تھے۔

ان کو بہت تلاش کیا، مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ دوسری طرف ٹریفک پولیس والوں نے تقاضا شروع کیا کہ گاڑی آگے بڑھاؤ۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی چشتی صاحب نہ ملے تو ہم لوگ قیام گاہ پر آگئے۔ یہاں آنے کے گھنٹہ بھر بعد وہ پہنچے اور یہ دلچسپ قصہ بیان کیا کہ ان کو ایک وکٹوریہ والا یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا کہ تمہارے ساتھی انتظار کر رہے ہیں۔ وکٹوریہ والے نے ان کو بمبئی کی خوب سیر کرائی۔ بمشکل تمام اس سے پیچھا چھڑایا۔

حسب معمول سیوری میں بھائی علی محمد نظامی کے ہاں قیام ہے۔ نہا دھو کر گشت شروع ہوئی۔ حنیف صاحب انجینئر ایکسپریس بلاک کمپنی تاج آفس علوی کمپنی بک سیلرز۔ کوہی پریس ایجنسی غرض یہ کہ احباب کے حلقے میں بہت لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ بمبئی میں اردو کا چرچا دلّی سے زیادہ ہے۔ اور کتابوں کی دوکانوں پر خاصی بھیڑ رہتی ہے۔

مجھے بمبئی کا شہر بالکل پسند نہیں ہے۔ جب یہاں آتا ہوں ایک وحشت کا سا احساس ہوتا ہے۔ اور فلیٹوں کی زندگی سے جہاں آسمان کی شکل نظر نہیں آتی جلد از جلد بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن جتنا بمبئی ناپسند ہے اتنی ہی یہاں کی مسجدیں پسند ہیں۔ اور ان کی صفائی آرائش و زیبائش اور حسن انتظامی دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوتی ہے۔ اور نماز میں بھی بڑا مزا آتا ہے۔ یہاں کے کاروباری مسلمانوں کا طبقہ بڑا دیندار ہے۔ اور جس طرح وہ تجارت میں کامیاب ہے اسی طرح مذہبی معاملات میں بھی پیش پیش رہتا ہے اور اس کی اس زندگی کا اظہار مسجدوں کی خوش انتظامی کی شکل میں بھی نظر آتا ہے۔ آج حمیدیہ مسجد اور ایک مینارے والی مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ پیش امام صاحب بھی بڑے خوش الحان تھے۔ جی خوش کر دیا۔

بعد مغرب گلاب خاں پیر خاں کمپنی کے دفتر میں محمود خاں صاحب اور عبداللہ خاں صاحب وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ بھی اسلام کا صحیح درد رکھنے والے مسلمان ہیں۔ عشاء کے بعد قیام گاہ پر بہت سے احباب ملنے تشریف لائے۔

میں سیوری کی عرب بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا ہوں کئی منزل کی خاصی ماڈرن عمارت ہے۔ اس کے مکین اکثر خوش حال اور پڑھے لکھے ہیں اور اپنے رہائش کے کمروں کو صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ لیکن بلا استثنا سب کے سب ایک بڑی تکلیف دہ بدمذاقی میں مبتلا ہیں۔ عمارت کے وسط میں چند مربع گز زمین شاید اس خیال سے بنانے والے نے چھوڑ دی ہے کہ رہنے والوں کو یاد رہے کہ مکانوں میں کوئی چیز صحن نام کی بھی ہوتی ہے۔ اس کھلی ہوئی جگہ یا کنویں میں پہلی منزل سے لیکر ساتویں منزل تک رہنے والا ہر شخص اپنے گھر کا سارا کوڑا کرکٹ اور باورچی خانے کی جھوٹ اور گندا پانی پھینکتا رہتا ہے۔ اور یہ جگہ انتہائی غلیظ اور گندا گھورا بن کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ عادی ہو گئے ہیں ورنہ نیا آدمی تو یہاں رہ کر یقیناً کسی وبا میں مبتلا ہو کر مر جائے۔ غالباً یہاں صفائی کرنے والوں کی بہت کمی ہے اور دوسرے مقامات کی طرح مہتر کے لئے ہر گھر میں جا کر صفائی کرنی ممکن نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے ہر شخص اپنے اپنے گھر کی بلا اس پنچایتی مقام پر ڈال کر پیچھا چھڑا لیتا ہے۔ کاش کہ ان لوگوں میں سے بعض کی عادت جاتی ہے اور ان کو معلوم ہو کہ اسلام میں صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کی کتنی اہمیت ہے۔

۱۵ ستمبر آج بھائی علی محمد نظامی کی لڑکی کی شادی ہے۔ کل سے سب گھر والے شادی کی رسوم اور تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لیکن اس مصروفیت سے زیادہ ان کو میری خاطر داری کی فکر ہے بھائی احمد نظامی تو سب کام چھوڑ کر ہر وقت میرے ساتھ ہیں۔ صبح صبح انھوں نے ہوٹل تاج میں سمندر کی سیر کرائی۔ اتوار کی وجہ سے بمبئی شہر سنسان معلوم ہوتا تھا۔ اور بازاروں میں سے گزرتے وقت یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی مقامات ہیں جہاں کل راستہ چلنا مشکل تھا۔ اتفاق سے مکتبہ جامعہ کھلا ہوا نظر آگیا۔ اس کے مینیجر شاہد علی خاں صاحب تعطیل سے فائدہ اٹھا کر اسٹاک چیکنگ میں مصروف تھے۔ شاہد صاحب بھی جامعہ ملیہ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ کالج میں مجھ سے سینیئر تھے۔ بڑی محبت سے ملے اور خاطر کی۔ اور کاروبار کے کچھ گر بھی بتائے۔ مگر میں نے تو ان کا سب سے بڑا گر یہی نوٹ کیا کہ اتوار کو بھی کام کر رہے تھے۔

بمبئی میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے پاس کشادہ مکان ہیں۔ اور جو بڑی تقریبات کا انتظام اپنے گھروں پر کر سکتے ہیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں کہی جاتی ہے۔ چنانچہ اس ماں کے زور نے یہاں کئی عالیشان شادی خانے بنوا دیئے ہیں۔ جہاں ہر قسم کی آسائشیں مہیا ہیں اور بڑی سے بڑی شادی آسانی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ ہر شخص ایک واجبی رقم دینے کے بعد ایک دو دن کے لئے کسی شادی خانے کو ریزرو کرا لیتا ہے۔

بھائی علی محمد نظامی نے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے نور باغ کو بک کرایا ہے دوپہر کو نور باغ میں احباب خاص طور پر غیر مسلم دست لنچ پر بلائے گئے تھے۔ اکسپریس بلاک کے سید اشفاق حسین صاحب اور محمد صاحب اور حنیف صاحب انجینیر اور ان کے صاحبزادے بھی تشریف لائے تھے۔

تیسرے پہر اسی نور باغ میں نکاح کی تقریب ہوئی۔ میمن برادری میں اصلاح رسوم کا بڑا اچھا کام ہوا ہے۔ اور بہت سی بیکار اور فضول رسمیں ختم کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ آج علی محمد صاحب کی صاحبزادی کے نکاح کے علاوہ پانچ نکاح انہی کی برادری کے اور تھے۔ انتظامات سب کی طرف سے مشترک ہیں۔ اس طرح خرچ بھی کم ہو گیا اور انتظام بھی اچھا ہوا۔ لیکن ساجھے کی ہنڈیا میں یہ مشکل ہمیشہ اور ہر جگہ پیش آیا کرتی ہے کہ کوئی تیز نمک کھاتا ہے کوئی کم۔ کوئی مرچوں کا شوقین ہوتا کوئی پھیکے کا۔ کوئی تر تراتا ہوا مال پسند کرتا ہے کسی کو ابالی بھاتی ہے اس لئے پکانے والا سب کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

چنانچہ آج کی مشترکہ شادیوں کے انتظام میں بھی ایسی چیزیں نظر آئیں جو متضاد ذوقوں کی آئینہ دار تھیں۔ خاص طور پر فلمی طائفے کی موجودگی نے جہاں نئے زمانے کے نوجوانوں کی دلچسپی کا کافی سامان مہیا کر رکھا تھا۔ وہاں پرانے خیال کے لوگ ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔

آرائش خوب تھی۔ اور ہر لونگ بھی شادی ضرب چھ کے حساب سے تھی۔ مگر پھر بھی سب خوش تھے۔ اور ہر طرف بہار تھی۔ اسٹیج پر چھ نوشہ بیک وقت سجے بنے بیٹھے تھے۔ اور زنانے میں چھ دلہنیں۔ نکاح کے بعد یہ دولہا اندر گئے تو

شاہے بہ ہر طریق وعروسے بہ ہر کنار

کا منظر تھا۔

علی محمد صاحب کی صاحبزادی کا نام زبیدہ اور ان کے دولہا کا نام عبدالستار ہے۔ جو علی محمد صاحب ہی کی برادری کے شکیل اور نیک نوجوان ہیں۔ دلی میں ہمارے یہاں بھی ایک دفعہ رہ چکے ہیں۔

نکاح کی تقریب سے فارغ ہو کر دلی واپسی کی فکر ہوئی۔ کل سے ریزرویشن حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ آج خلاف توقع اس میں کامیابی ہوئی اور کل ۱۶ ستمبر کے لئے ایک برتھ مل گئی۔ ریلوے اسٹیشن پر حیدرآباد کے مرتضیٰ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جنھوں نے حضرت بابا تاج الدین ناگپوری کے فیوض کے بہت سے قصے بیان کئے۔ اور بتایا کہ وہ حضرت خواجہ صاحب کا اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے۔

علی محمد نظامی صاحب کے گھر میں شادی کا اجتماع ہے۔ اسلئے میرے سونے کا انتظام حاجی ولی محمد ہاشم صاحب کے دفتر میں ہے۔ یہاں ہر طرح کا آرام ہے لیکن کھٹملوں کی آبادی ہر قسم کے برتھ کنٹرول سے آزاد معلوم ہوتی ہے۔ رات بھر ان کا ہجوم رہا۔ اور نیند کو حاضر غائب کا وظیفہ پڑھنا پڑا۔ بمبئی میں مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے کھٹمل بہت ہوتے ہیں۔ بڑا مشہور لطیفہ ہے کہ استاذی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور استاذی پروفیسر محمد مجیب صاحب بمبئی میں ایک ساتھ ٹھیرے ہوئے تھے۔ رات کو ڈاکٹر عابد صاحب کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مجیب صاحب پلنگ پر بیٹھے ہوئے کچھ کھٹ پٹ کر رہے ہیں۔ عابد صاحب نے خیریت پوچھی تو مجیب صاحب نے کہا کہ کھٹملوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ سن کر عابد صاحب نے نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ

"مدح صحابہ کیجئے مدح صحابہ! اپنے آپ بھاگ جائیں گے"۔

دلچسپ بات یہ کہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب جنھوں نے یہ بات کہی شیعہ ہیں اور مجیب صاحب سنی!

۱۶ ستمبر محترم سید اشفاق حسین صاحب نے صبح سے اپنی موٹر بھیج دی تھی۔ اسلئے بڑی آسانی اور آرام سے آج بمبئی کی بقیہ ملاقاتیں ہو گئیں۔ حسب معمول مولانا عبدالحمید جو میرے مدیر صبح امید کے پاس بھی گیا اور بڑی دلچسپ صحبت رہی۔ سنتری کے قونصل رحیم کریم صاحب نے بھی بڑی شفقت فرمائی۔ عزیز علی بھائی شرف علی بک سیلرز لور علوی مکڈپو سے کاروباری باتیں بھی ہو گئیں۔

دوپہر کے کھانے کی دعوت حاجی احمد ریانی صاحب کے ہاں تھی۔ صاحبزادہ فضل احمد صاحب کے علاوہ اجمیر شریف کے ایک اور صاحبزادے صاحب بھی جو بمبئی آئے ہوئے ہیں۔ اور بعض دیگر احباب مدعو تھے۔ کھانے کے بعد عبدالرحمٰن نظامی مرحوم کے مکان پر بھی گیا۔ تیسرے پہر پیر بھائی مجھے چھوڑنے اسٹیشن آئے۔ اور ان کے ساتھ حضرت صاحبزادہ فضل احمد صاحب اور اجمیر شریف کے دوسرے صاحب نے بھی پھول پہنا کر ممنون احسان بنایا۔ حاجی احمد نظامی اور بھائی علی محمد نظامی نے تو خاطرداری کی انتہا کر دی۔ انکی برادری کے لوگوں کا تقاضا تھا کہ بقیہ پانچ شادیوں کی تقریبات اور دعوتوں میں بھی شرکت کی جائے جن کا سلسلہ بھی کئی دن چلے گا۔ ان سب محبوں سے معذرت کرنی پڑی

علی گڑھ تاریخ ادبِ اردو

از رشید حسن خاں صاحب

ذیل کا مضمون ماہنامہ تحریک دہلی کے شکریے کے ساتھ نقل کیا جارہا ہے۔ اس مضمون میں جناب رشید حسن خاں نے نہایت محنت اور قابلیت سے علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ اگرچہ خان صاحب کی تنقید "یک رخی" ہے اور اس میں صرف خامیوں ہی کا تذکرہ ہے لیکن کتابت اور چھپائی اور زبان وغیرہ کی بعض غلطیوں سے قطع نظر کرنے کے بعد کہ وہ ہر بڑے کام میں رہ جاتی ہیں۔ اور اس باب میں گفتگو کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ بقیہ اغلاط واقعی ایسی ہیں جو علی گڑھ کو بدنام کرنے والی ہیں۔ اور اس کا فوراً نوٹس لیا جانا چاہیئے۔

ہمیں امید ہے کہ اس تاریخ کے بقیہ کام کی تکمیل اور مطبوعہ ایڈیشن کی اشاعت رشید حسن خاں صاحب کے اس احتسابی مضمون کی روشنی میں ہوگی۔ اور اس سے کماحقہ' فائدہ اٹھایا جائے گا۔

زیر نظر مضمون میں صوفیائے کرام کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک تفصیلی نوٹ حلقۂ نظامیہ میں ملاحظہ فرمائیے

(ایڈیٹر)

اردو میں کئی چیزوں کی شدید کمی محسوس ہوتی ہے: مثلاً ایک ایسا جامع لغت، جو جدید اصول لغت نویسی کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہو! قواعد کی ایسی کتاب، جو سارے جزئی و کلی مسائل پر حاوی ہو! من جملہ ان کے، تاریخ ادب کی بھی ایسی کوئی کتاب ہمارے پاس نہیں ہے جو زبان و ادب کے ارتقا کی مکمل آئینہ دار ہو۔

اردو نسبتاً ایک جدید زبان ہے۔ بعض دوسری قدیم اور وسیع الذیل زبانوں کی طرح، اس میں مدوجزر اور قومی عروج وزوال کے اتنے نشیب فراز نہیں ہیں۔ جن سے وہ زبانیں دوچار رہی ہیں۔ اس کے باوجود، گجرات و دکن سے لے کر، شمالی ہند کے عہد ارتقا تک۔ زبان کئی مرحلوں سے گزری ہے۔ اس عہد کی نظم و نثر کا سرمایہ ادھر ادھر بکھرا ہوا ہے، اور اس کا خاصہ حصہ بہ لحاظ انتساب، ہنوز فیصلہ طلب ہے۔۔ اس لئے تاریخ ادب پہ کام کرنے والوں کے راستے میں دوچار، بہت سخت مقام آتے ہیں۔

تاریخ ادب کی بھیا قوم کی، تاریخ نویسی کے جدید معیار و انداز کے باعث، اس کی ترتیب تنہا کسی فرد کے بس کی بات نہیں۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں یہ مشکل اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک مختلف ادوار پر مربوط کام نہیں ہوا ہے: نہ ہر دور کے سرمایۂ کلام کی شیرازہ بندی ہوئی ہے۔ امیر خسرو اور ان کے عہد کے صوفیہ و شعرا سے جو کلام منسوب کیا جاتا ہے اور جس کی بنیاد پر کچھ نتائج اخذ کئے جاتے ہیں؛ ابھی تک اس کا بیشتر حصہ صحت انتساب کا محتاج ہے ان مشکلوں کے علاوہ، اتنے بڑے کام کے لئے خاصے سرمایے کی بھی ضرورت ہے۔ موجودہ حالات میں، سب سے مشکل مرحلہ یہی ہے

اب سے کئی برس پہلے، یہ خبر سن کر بے حد مسرت ہوئی تھی کہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن نے، علی گڑھ یونیورسٹی کی پیش کی ہوئی تاریخ ادب اردو کی اسکیم کو منظور کرلیا ہے۔ یہ بات سن کر بھی اطمینان ہوا تھا کہ فاضلوں کی ایک جماعت اس تاریخ کو مرتب کرے گی۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے، ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحبان، ترتیب و نظر ثانی کے مشکل فرائض کو انجام دیں گے۔

برسوں کے انتظار کے بعد، اس تاریخ کی پہلی جلد شائع ہوئی جس کو پڑھ کر، سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے، کہ غالباً غلط نگاری کے کسی مقابلے میں حصہ لینے کے لئے، اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب کی تمہید میں کئی جگہ مغرب میں ادبی تاریخ نگاری کا ذکر کیا گیا ہے، یہ بھی کہا گیا

ہے کہ یہ کتاب بھی، مغربی تاریخوں کے انداز و معیار کو ملحوظ رکھ کر، اسی طرز پر مرتب کی گئی ہے، لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا کہ وہاں اصل حیثیت ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ اس کی علمیت اور صلاحیت نظر ثانی و حسن ترتیب کے فرائض کو ادا کرتی ہے اور منتشر اجزا کی شیرازہ بندی کرتی ہے، جس سے یہ تاریخ معتبر ہے۔ درحقیقت اس کو ایسے مضامین کا مجموعہ کہنا چاہیئے، جن میں نہ باہم ربط ہے، نہ تناسب و توافق اس کے بجائے، متضاد بیانات، غیر متعلق تفصیلات، غلط تعین اور غیر معتبر اقتباسات کی فراوانی ہے۔

ہمارے یہاں ناموں سے مرعوب کرنے کا اچھا خاصا رواج ہے۔ اس کا نتیجہ بعض وقت بے حد عبرتناک ہوتا ہے۔ کچھ مشہور افراد کے نام لکھ کر، یہ فرض کر لیا جاتا ہے، کہ ترتیب و تدوین کے سارے تقاضے بھی پورے ہو گئے اور ہر قسم کی بے احتیاطیوں کے جواز کا عذر بھی ہاتھ آگیا ہے۔ یہ کتاب اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔ دو معروف نقاد، پروفیسر آل احمد سرور اور جناب مجنوں گورکھپوری، بالترتیب اس کے ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ تنقید میں دونوں حضرات کا مرتبہ مسلم سہی، لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پہلی جلد سراسر تاریخی و تحقیقی خشک بیانیوں کا مجموعہ ہے تحقیق میں نہ ایسی ہوائی بجلیاں ہوتی ہیں نہ دھلی دھلائی چاندنی۔ نہ اس میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کا ذکر ہو یا بیدل کی شاعری کا، ہر موضوع کو کسی فرضی صاحبزادی کو سمجھایا جاسکے! یہ نہایت خشک، نسبتہً غیر دلچسپ اور اس سے بھی زیادہ صبر آزما کاروبار ہے۔ آدمی اسی کا ہو رہے، تب کچھ کر سکتا ہے ـــــ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب گناہ گار کا نامۂ اعمال بن گئی۔ اس میں ہر قسم کی اتنی غلطیاں ہیں کہ اب آب حیات کی غلطیوں کو شمار کرنا، اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور اس کتاب کے ساتھ بھی۔

اس کتاب کا سب سے زیادہ قابل اعتراض حصہ، اس کا پہلا باب ہے، جس کا عنوان ہے، "سیاسی اور تمدنی پس منظر" اس باب کی تین خصوصیتیں قابل ذکر ہیں: ایک تو یہ کہ مجموعی طور پر، کتاب سے اس کا کم سے کم تعلق ہے، یہ بیشتر غیر متعلق باتوں پر مشتمل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پورا باب پڑھنے کے بعد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ زبان کے آغاز و ارتقا پر ان حالات کا کیا اثر پڑا۔

دوسری یہ کہ، مقالہ نگار نے جگہ جگہ ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے جو بہت سے لوگوں کی دل آزاری کا سبب بن گیا ہے۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جن خیالات کو ایمانداری کے ساتھ برحق سمجھتا ہے ان کو بیان کرے۔ لیکن یہ بیان اسکو اپنی تصنیفات تک محدود رکھنا چاہیئے، ایسی کتاب، جس کا اس موضوع سے براہ راست تعلق نہ ہو، اور جو کسی ایک نقطہ نظر کے ماننے والوں کے لئے نہیں، سب کے لئے مرتب کی گئی ہو، اس میں ان باتوں کا ذکر نہیں ہونا چاہیئے جو آج تک مختلف فیہ ہیں، یا جن کی تعبیر کسی خاص اندازِ فکر کی روشنی میں پیش کی گئی ہو۔

مقالہ نگار کو اس کا حق ہے کہ وہ عظیم المرتبہ صوفیہ کو "خیرات خوار" سمجھیں، اورنگ زیب کو دنیا کا بدترین حکمراں مانیں۔ اکبر کے دین الٰہی کو منشور انسانیت قرار دیں۔ ان کو یہ بھی حق ہے کہ وہ مسلمان بادشاہوں کے خالص حکومتی اقدامات کو مسلم آئین حکمرانی کے مسلمہ اصول، قرار دے کر، طنز و تعریض کے تیروں سے اپنا ترکش خالی کرلیں، اور اس طرح اپنی وسیع الخیالی یا قوم پرستی کی صفت میں کچھ اور اضافہ کرلیں؛ لیکن، ان کو اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ تاریخ ادب کی کسی ایسی کتاب میں، جو محض ان کے انداز فکر کی ترجمانی کے لئے مرتب نہیں کی گئی ہے، ان مفروضات کو پیش کرکے، نارسیدہ طلبا کو اپنے مخصوص خیالات کی تلقین کا نشانہ بنائیں۔ تاریخ ادب کی کتابیں اس لئے مرتب نہیں کی جاتیں، کہ ان سے کوئی شخص اپنے ذاتی خیالات کی نشر و اشاعت کا کام لے، جب کہ ایک قابل ذکر گروہ ان کو غلط سمجھتا ہو۔

اس باب کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مقالہ نگار نے انتہائے سادگی سے جگہ جگہ ایسے کلیے قائم کئے ہیں، جن کو کوئی شخص تسلیم نہیں کر سکتا۔ آگے چل کر اس باب سے ایسی کچھ مثالیں پیش کی جائیں گی۔

اس کتاب کی یہ خصوصیت بھی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی، کہ اگر اس میں دو مقالہ نگاروں نے کسی واقعے کا ذکر کیا ہے یا کوئی سنہ لکھا ہے، تو اکثر مقامات پر، دونوں نے مختلف سنہ لکھے ہیں، اور متضاد باتیں کہی ہیں۔ اور اگر اتفاق سے کسی تیسرے مضمون نگار نے بھی اسی سنہ کو لکھا ہے، تو اس نے ان دونوں سے مختلف سنہ

درج کیا ہے۔ یہی نہیں، ایک ہی مضمون نگار نے ایک ہی واقعے کے دو مختلف سنہ لکھے ہیں۔ اور یہ سب بجنسہٖ موجود ہیں۔ نظر ثانی کرنے والوں نے اس اختلاف و تضاد کو کس طرح روا رکھا اس کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں: یا تو یہ کہ وہ تاریخ ادب کی کتاب میں متضاد اقوال اور مختلف سنین کو غلط نہیں سمجھتے، اور اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ ان حضرات نے مغربی ادب کی کسی ایسی اعلا درجے کی تاریخ کو دیکھ لیا ہو، جس میں اس نوع کے اختلافات موجود ہوں یا یہ کہ نظر ثانی کی ہی نہیں۔ ـــ یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ حضرات، اختلافِ سنین یا تضادِ بیان کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔

محض اثبات مدعا کے لئے، ایسے چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے قبل ایک دل چسپ بلکہ صحیح الفاظ میں عبرتناک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں، جس سے اس بے پروای اور بے احتیاطی کا کچھ اندازہ ہوگا، جس کو نہایت اطمینانِ خاطر کے ساتھ روا رکھا گیا ہے:

کتاب کے گرد پوش پر دو جگہ اور سرورق پر، کتاب کا نام غلط لکھا ہوا ہے۔ کتاب کا پورا نام "علی گڑھ تاریخ ادب اردو ہے" اس میں جہاں لفظِ اردو کے الف اور واؤ پر نہایت اہتمام کے ساتھ پیش اور جزم لگائے گئے ہیں، اسی اہتمام کے ساتھ لفظ ادب کی ب پر جزم لگایا گیا ہے (تاریخ ادبْ اُرْدُو) یہ غالباً اپنی نوعیت کی منفرد مثال ہے کہ اتنے بڑے ادارے سے شائع ہونے والی اس قدر اہم کتاب کا نام بھی صحیح نہیں ہے۔ فاعتبروا ......

۱۔ ص ۱۶ پر امیر خسرو کا سالِ ولادت سنہ ۱۲۵۳ء لکھا ہوا ہے اور سنہ وفات سنہ ۱۳۲۵ء۔ اسی مقالہ نگار نے ص ۳۸ پر سال ولادت سنہ ۱۲۵۴ لکھا ہے۔ ایک دوسرے مقالہ نگار نے ص ۷۴ پر سنہ وفات سنہ ۱۳۲۴ء لکھا ہے۔

۲۔ ص ۱۷ پر حضرت روشن چراغ دہلوی کا سال وفات سنہ ۱۳۵۶ء درج ہے اسی مقالہ نگار نے ص ۱۹ پر سنہ وفات سنہ ۱۳۵۲ء لکھا ہے

۳۔ ص ۲۱ پر کبیر کا سال وفات سنہ ۱۵۱۵ء درج ہے۔ دوسرے مقالہ نگار نے ص ۸۰ پر سنہ ۱۵۱۸ء لکھا ہے۔ البتہ سالِ ولادت میں دونوں متفق ہیں۔

۴۔ ص ۲۹ پر افضل کو متوفی سنہ ۱۶۲۵ء لکھا گیا ہے۔ دوسرے مقالہ نگار نے ازراہِ احتیاط سنہ ۱۶۲۵-۲۶ء لکھا ہے (ص ۱۹۴)

۵۔ ص ۳۲ پر ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ جب حضرت خواجہ گیسو دراز کے والد دہلی سے دکن گئے، تو ان کی عمر "پانچ سال کے قریب تھی" ـــ دوسرے مقالہ نگار نے ص ۱۵۴ پر جو کچھ لکھا ہے اس سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اس نے لکھا ہے: "حضرت گیسو دراز کے والد جس وقت دہلی سے دولت آباد آئے، آزاد بلگرامی نے گیسو دراز کی عمر چار سال بتائی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہو سکتا..... دولت آباد آنے کے وقت اس کی عمر سات سال کی ہونی چاہئے۔

۶۔ ص ۳۸ پر شیخ باجن کا سالِ وفات سنہ ۱۵۰۶ء لکھا ہوا ہے۔ دوسرے مقالہ نگار نے ص ۱۰۵ پر آپ کا سن ولادت سنہ ۱۳۸۸ء / ۷۹۰ھ لکھ کر وفات کے متعلق لکھا ہے کہ "۱۲۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔" سال ولادت سنہ ۱۳۸۸ء میں ۱۲۱ جوڑے جائیں، تو سال وفات سنہ ۱۵۰۹ء ہوگا۔

تیسرے مقالہ نگار نے ص ۲۵۹ پر سال ولادت سنہ ۱۳۰۲ء / ۷۰۲ھ اور سال وفات سنہ ۱۳۸۸ء / ۷۹۰ھ لکھا ہے۔ گویا جو سنہ ایک مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق، سالِ وفات ہے؛ وہ دوسرے کی تحقیق کے مطابق سالِ ولادت ہے۔ اس مہمل نگاری کی بھی کوئی حد ہے! یہ غلط نگاری اور نظر ثانی کے ذمے داروں کی خاموش تائید، دونوں بے حد شرمناک ہیں۔

۷۔ ص ۶۰ پر علاء الدین خلجی کا زمانہ سنہ ۱۲۹۶ء سے ۱۲۹۶ سنہ تک بتایا گیا ہے۔ دوسرے مقالہ نگار نے ص ۷۴ پر "علاء الدین خلجی ۱۲۹۵-۱۳۱۵ء" لکھا ہے۔

۸۔ ص ۶۵ پر ایک مقالہ نگار نے محمود تغلق کا سنہ وفات سنہ ۱۳۱۴ء لکھا ہے، دوسرے مقالہ نگار نے ص ۸۷۴ پر اس کا سال وفات سنہ ۱۳۱۳ لکھا ہے۔

۹۔ ص ۷۶ پر ایک مقالہ نگار نے، حضرات شیخ معین الدین چشتی رح قطب الدین بختیار کاکی رح فرید الدین گنج شکر رح نظام الدین اولیاء رح اور نصیر الدین چراغ دہلی رح کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "انہوں نے کوئی تصانیف نہیں چھوڑیں۔ جو تصانیف ان کے نام منسوب ہیں، وہ سب بہت بعد کی ہیں اور جعلی ہیں۔"

لیکن اس سے پہلے ایک دوسرے فاضل مقالہ نگار ص ، پر لکھ چکے ہیں ۔ "امیر خسرو کی زبان کے بارے میں جو شبہ ہم نے ظاہر کیا ہے اس کا ثبوت سندی کے ان فقروں سے بھی مل جاتا ہے ، جو ان کے پیر بھائی حضرت روشن چراغ دہلوی متوفی ۱۳۵۶ء کی تصنیف "خیر المجالس" میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں ۔"

(یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اول الذکر مقالہ نگار کے قول کی بنیاد "خیر المجالس" ہی کے ایک ملفوظ پر ہے ، جس کا مفصل ذکر کیا جائے گا)

۱۰ - ص ۱۰۰ پر "حضرت شاہ عالم ۸۹۰ھ - ۱۴۸۵ء" لکھا ہوا ہے یہ اس صفحے کی آٹھویں سطر میں ہے ۔ اسی صفحے کی بارھویں سطر میں شاہ عالم "۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء" لکھا ہوا ہے ۔ اختلاف کے علاوہ ، دونوں جگہ یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ سنہ ولادت یا سنہ وفات ـــــ اس نوع کی عدم صراحت اور مقامات پر بھی ہے ۔

۱۱ - ص ۱۵۱ پر ، دوسری سطر میں ، شیخ عین الدین گنج العلم کا سال وفات ۷۹۹ھ/۱۳۹۶ء درج ہے ۔ اسی مقالہ نگار نے اسی صفحے کی تیئیسویں سطر میں ، آپ کا سنہ وفات ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء لکھا ہے ۔ ایک دوسرے مقالہ نگار نے ص ۴۷۶ پر ۱۳۹۳ء کو سال وفات قرار دیا ہے ۔

۱۲ - ص ۱۵۵ پر ، حضرت خواجہ گیسو دراز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے ۔ "امیر تیمور کے دہلی پر حملے کے زمانہ میں آپ نے دہلی کی اقامت ترک کی اور ربیع اول کی ساتویں ۸۰۱ / ۲۷ نومبر ۱۳۹۸ء کو گھر سے دکن کی طرف روانہ ہوئے ۔ اس وقت آپ کی عمر اسی سال کی تھی ۔"

ص ۴۷۶ پر دوسرے مقالہ نگار نے لکھا ہے ۔

"حضرت گیسو دراز نے ۸۰ برس کی عمر میں (۱۳۹۸ء) دہلی سے حرکت کی اور گجرات ہوتے ہوئے ، ۱۴۱۲ء میں گلبرگہ پہنچے تھے ۔"

اول الذکر مقالہ نگار نے ص ۱۵۶ پر لکھا ہے کہ خواجہ صاحب ۸۰۲ھ/۱۳۹۹ء میں گلبرگہ تشریف لائے ـــــ گویا مقالہ نگار اور نظر ثانی کرنے والے ، دونوں کی رائے میں ۱۳۹۹ء اور ۱۴۱۲ء میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے ۔ اور ان کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف اوقات میں ظہور پذیر ہوا ہو ۔

۱۳ - ص ۱۹۲ پر ، علی عادل شاہ اول کا سال وفات ۹۸۸ھ/۱۵۸۰ء درج ہے حالانکہ ۹۸۸ھ برابر ہے ۱۵۸۰ء کے ص ۴۹۴ پر سال وفات ۱۵۸۰ء/۹۸۸ھ درج ہے ۔

۱۴ - ص ۲۶۶ پر ایک مقالہ نگار نے خواجہ گیسو دراز کا سنہ وفات ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء لکھا ہے دوسرے مقالہ نگار نے ص ۴۷۶ پر ۱۴۲۲ء لکھا ہے ص ۱۵۶ پر بھی یہی سنہ وفات درج ہے ۔

۱۵ - ص ۲۹۲ پر ، ایک مقالہ نگار نے مثنوی پھول بن کا سال تصنیف ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء لکھا ہے دوسرے مقالہ نگار نے ص ۳۵۵ پر ، اس کا سال تصنیف ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء لکھا ہے پھر اسی مقالہ نگار نے ص ۳۵۰ پر ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵ء کو سال تصنیف بتایا ہے

۱۶ - ص ۲۶۱ پر محمد قلی قطب شاہ کا سال وفات ۱۶۱۲ء لکھا ہوا ہے ۔ اسی مقالہ نگار نے ۳۴۵ پر ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء کو سال وفات قرار دیا ہے ۔

۱۷ - ص ۳۷۳ پر محمد قطب شاہ کا سال وفات ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء درج ہے اسی مقالہ نگار نے ص ۳۸۵ پر سال وفات ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء لکھا ہے

۱۸ - ص ۳۶۸ پر ، وجہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "اس نے ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۰ء میں ایک کتاب قطب مشتری لکھی " ص ۳۵۷ پر ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء کو سال تصنیف بتایا گیا ہے ۔ یہی سنہ اور صفحات پر بھی ہے ۔ اول الذکر سنہ عیسوی کو پریس کی غلطی مانا جا سکتا ہے ، لیکن ص ۲۶۵ پر لکھا ہوا ہے کہ قطب مشتری ، ابراہیم نامہ سے صرف پانچ سال بعد لکھی گئی ص ۲۶۰ پر ابراہیم نامہ کے متعلق لکھا ہے کہ " یہ نظم ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۴ء میں تکمیل کو پہنچی ـــــ ابراہیم نامہ کے سال تکمیل ۱۰۱۲ھ میں پانچ سال شامل کئے جائیں ، تو قطب مشتری کا سال تصنیف ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۹ء ماننا پڑے گا ۔

۱۹ - ص ۳۰۹ پر بحری کا سال وفات ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء لکھا ہے ۔ ص ۴۵۹ پر ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء درج ہے ۔

۲۰ - ص ۴۰۲ پر ، ایک مقالہ نگار نے یقین کے ساتھ لکھا ہے "جدید تحقیقات کے مطابق ، ولی کا وطن احمد آباد گجرات ہے ۔"

دوسرے مقالہ نگار نے ص ۵۱۰ پر خطابیانہ انداز میں لکھا ہے "ہاں جب دکن یا گجرات میں ولی سا صاحب کمال پیدا ہوا ۔ "

۲۱ - ص ۳۸۰ کی چھٹی سطر میں ، مقالہ نگار نے لکھا ہے ، "وجہی نے ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء اور ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۱ء کے درمیانی زمانے میں وفات پائی ۔" اسی مقالہ نگار نے ، اسی صفحے کی سولہویں سطر میں لکھا ہے : وجہی ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء کے قریب فوت ہوئے تھے ، یہ لکھنا بھی بے محل نہ

کہ سنہ [illegible] کے بجائے سنہ [illegible] کے مطابق ہے۔

۲۲۔ ص ۴۸ پر لکھا گیا ہے۔ "بعض محققوں کے مطابق شمالی ہند میں اردو کی پہلی غزل شاہجہاں ہی کے عہد میں پنڈت چندربھان برہمن نے لکھی تھی۔" اس کے بعد یہ غزل درج کی گئی ہے (بعض محققوں کے مطابق" کے ابہام سے قطع نظر کی جاتی ہے) اس کے بعد مقالہ نگار نے لکھا ہے۔" غزل مذکورہ کو زبانِ دہلی کی نشأۃ الثانیہ کا پہلا نقش کہا جا سکتا ہے۔" اس عبارت سے یہ بات قطعیت کے معلوم ہوتی ہے کہ مضمون نگار کی رائے میں بھی یہ غزل برہمن کی ہے اور اسے پہلا نقش کہا جا سکتا ہے"

لیکن دوسرے مقالہ نگار نے ص ۴۹۴ پر، برہمن کا ذکر کرتے ہوئے، اسی غزل کے متعلق لکھا ہے۔" ایک غزل اس کی طرف بھی منسوب ہے۔ لیکن اس کی زبان اتنی صاف ہے کہ اسے اتنی قدیم مانتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔" میں عرض کروں کہ یہ بالکل ثابت نہیں کہ یہ غزل برہمن کی ہے، بلکہ برہمن کا ریختے میں شعر کہنا ہی محتاجِ ثبوت ہے۔

۲۳۔ ص ۲۷۴ پر نصرتی کا ایک مطلع اس طرح درج ہے:

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سرجنہار کا
افلاک کا اونچا چھجا باندیا ہے کس لیتار کا

ص ۲۲۹ پر دوسرے مقالہ نگار نے اس کو اس طرح لکھا ہے۔

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سرجنہار کا
افلاک کا اونچا سنبدیا ہے محل کس لیتار کا

یہ چند مثالیں محض نمونۂ کلام کا حکم رکھتی ہیں۔ اس قسم کے اختلافات جگہ جگہ ہیں۔ ان اختلافات نے اس کتاب میں درج کیے گئے سنین، اقوال اور اقتباسات کو بے حد مشکوک بنا دیا ہے۔ جب تک اصل سے مقابلہ نہ کر لیا جائے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صحیح صورت کیا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ ہر شخص کی رسائی اصل ماخذ تک نہیں ہو سکتی، اس لیے نتیجہ معلوم!

کتاب میں بیشتر مقامات پر سنہ ہجری و عیسوی، دونوں کو درج کیا گیا ہے۔ اس کی افادیت مسلم ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک نہایت اہم بات کو نظر انداز کر دیا گیا جس کے سبب سے اس کی افادیت ختم ہونے کے ساتھ ساتھ، غلط فہمی کی بڑی گنجائش نکل آئی ہے — یہ مسلمات میں سے ہے کہ جب تک تاریخ اور مہینے کا تعین نہ ہو، اس وقت تک یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں سنہ ہجری مطابق ہے فلاں سنہ عیسوی کے یا اس کے برعکس۔ اکثر اوقات سنہ کے صحیح تعین کے لیے صرف مہینے کا تعین بھی کافی ہوتا ہے۔ تاریخ و ماہ نہ معلوم ہونے کی صورت میں، اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اگر سنہ ہجری کے مقابل سنہ عیسوی درج کیا جائے تو اگر اس سنہ ہجری کے کسی بھی مہینے سے کوئی دوسرا سنہ عیسوی شروع ہو جاتا ہے، تو وہ دونوں سنہ عیسوی درج کیے جائیں، اس کے بغیر کبھی صحیح تعین نہیں ہو سکتا۔

مقالہ نگاروں نے اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی ہے اس بے پروائی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تقریباً ایسے سارے مقامات پر تعین کو بالکل صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ میں ذیل میں صرف دو مثالیں کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اس سے مکمل وضاحت ہو جائے گی:

۱۔ ص ۵۵۴ پر، مرزا مظہر جانجاناں کا سنہ وفات سنہ ۱۱۹۵ھ سنہ ۱۷۸۰ء درج ہے۔ سنہ ہجری بالکل صحیح ہے۔ لیکن سنہ عیسوی غلط ہے سنہ ۱۱۹۵ھ حاوی ہے سنہ ۱۷۸۰-۸۱ء پر۔ جب تک یہ متعین نہ ہو کہ ان کی وفات کس مہینے میں ہوئی، یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سنہ عیسوی کیا ہوگا۔ مرزا مظہر علی کی وفات ۱۰ محرم سنہ ۱۱۹۵ھ کو ہوئی تھی (مقاماتِ مظہری) یہ مطابق ہے ۶ جنوری سنہ ۱۷۸۱ء کے۔ اس طرح محض بے احتیاطی کی بنا پر سنہ عیسوی غلط ہو گیا۔

۲۔ ص ۲۶۶ پر ایک مقالہ نگار نے خواجہ گیسو دراز کا سنہ وفات ۸۲۵ھ لکھا ہے دوسرے مقالہ نگار نے ص ۷۶۴ پر سالِ وفات سنہ ۱۴۲۱-۲۲ء لکھا ہے۔ تیسرے مقالہ نگار نے ص ۵۶۱ پر تاریخ وفات بھی لکھا ہے۔"۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ/ یکم نومبر سنہ ۱۴۲۲ء کو انتقال کیا" ۸۲۵ھ حاوی ہے سنہ ۱۴۲۱-۲۲ء پر اول الذکر اختلافات کی وجہ یہی ہے کہ مہینے کے تعین کے بغیر، سال کا تعین کیا گیا۔ جس کا نتیجہ دو مختلف سنین کی صورت میں نکلا۔ ایسی بے احتیاطیاں اس کتاب میں بکثرت ہیں۔

اس اصولی غلطی کے علاوہ، بے اعتنائی و کم احتیاطی کا عمومی انداز کارفرما نظر آتا ہے کہیں مادۂ تاریخ سے جس سنہ کا تعین کیا ہے

وہ صحیح نہیں ہے۔ کہیں تاریخ و ماہ کے تعین کے باوصف، مطابقت ظاہر کرنے کے لئے جو سنہ عیسوی درج کیا گیا ہے، وہ صحیح نہیں، اور کہیں کتاب کا انتساب غلط ہے۔ میں اس ذیل میں صرف چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ صورت حال کی وضاحت کے لئے یہ کافی ہیں:

۱ — ص ۳۰۱ پر مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ وفاتِ نصرتی درج ہے۔

ضربِ شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ — جاکے جنت میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آملا یک نے — یوں کہے۔ نصرتی شہید رہے

مقالہ نگار نے لکھا ہے: "نصرتی شہید رہے" سے ۱۰۸۵ھ نکلتا ہے۔"

یہ قطعی غلط ہے کہ مذکورہ مادے [نصرتی شہید رہے] سے ۱۰۸۵ھ نکلتا ہے۔ اس سے ۱۲۸۲ھ نکلتا ہے، اور یہ نصرتی کا سنہ وفات نہیں ہو سکتا یہ بھی عرض کردوں کہ قطعے کا مصرع ثانی ساقط الوزن ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مصرع غلط سلط نقل کیا گیا ہے۔ لیکن اس پر کسی تعجب کا اظہار بے جا ہے۔ پوری کتاب اسی قسم کی غلط نگاری و غلط سازی کے مظاہروں سے بھری ہوئی ہے۔

۲ — ص ۵۰۲ کے حاشیے میں، بیدل کے متعلق لکھا گیا ہے: "۳ صفر ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۱ء میں انتقال کیا۔"

۳ صفر ۱۱۳۳ھ مطابق ہے ۲۳ نومبر ۱۷۲۰ء کے (بلحاظ تقویم مرتبۂ انجمن ترقی اردو۔ اشاعت ثانی) چونکہ ۱۱۳۳ھ حاوی ہے ۱۷۲۰ء اور ۱۷۲۱ء پر، جب تک بلحاظ تاریخ و ماہ، سنہ عیسوی کا تعیین نہ کیا جائے اس غلطی کا امکان رہے گا کہ ۲۰ء کے بجائے ۲۱ء یا ۲۱ء کے بجائے ۲۰ء درج ہو جائے۔ یہاں بھی یہی ہوا ہے۔

۳ - بیدل کی تاریخ وفات ۳ صفر ۱۱۳۳ھ لکھی گئی ہے۔ سنہ صحیح ہے، تاریخ غلط ہے۔ صحیح تاریخ ۴ صفر ہے۔ بیدل کی تاریخِ وفات کا مادہ یہی "یوم پنجشنبہ چہارم ماہِ صفر" ہے۔ (سفینۂ خوشگو) ۱۱۳۳ھ

۴ - ص ۱۲۱ پر، حضرت خوب محمد چشتی کا مادہ تاریخ وفات "خوب تھے" لکھا ہے۔ اس سے ۱۰۲۳ھ نکلتا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے: "اگر "خموش" کے ۹۴۶ عدد کو سالِ ولادت قرار دیا جائے تو ان کی عمر ۷۴ سال کی ہوتی ہے۔" ۹۴۶ اور ۷۴ کو جوڑا جائے، تو سالِ وفات ۱۰۲۰ھ ہوگا۔ جو مذکورہ مادۂ تاریخ کے خلاف ہے۔ اس اختلاف کو سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ حساب جاننے یا حساب لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

۵ - ص ۱۰۱ پر، شاہ وجیہہ الدین علوی کے متعلق لکھا گیا ہے:- "لفظ شیخ سے ان کا سن ولادت اور شیخ وجیہہ الدین سے ان کا سنہ وفات ۹۹۱ھ / ۳/ ۱۸۶ نکلتا ہے۔" یہ غلط ہے۔ "شیخ وجیہہ الدین" سے ۱۲۰۹ھ نکلتا ہے۔ مقالہ نگار نے ۹۹۱ھ کو ۱۷۸۳ء کے برابر مانا ہے، یہ بھی غلط ہے، ۹۹۱ھ برابر ہے ۱۵۸۳ء کے

۶ - ص ۱۵۶ پر ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے۔ "خواجہ صاحب ۸۰۳/ ۱۳۹۹ میں گلبرگہ تشریف لائے۔" مقالہ نگار تقویم کو احتیاط کے ساتھ دیکھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ ۸۰۳ھ مطابق ہے ۱۴۰۰-۱۴۰۱ء کے۔

۷ - ص ۷ پر ایک فاضل مقالہ نگار نے "خیر المجالس" کو، حضرت روشن چراغ دہلیؒ کی "تصنیف" لکھا ہے۔ مقالہ نگار نے غالباً کتاب کو خود نہیں دیکھا ورنہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہ حضرت روشن چراغؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ جس کو مولانا حمید قلندر نے مرتب کیا تھا۔

پہلے باب کے متعلق مختصراً اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس باب کا بیشتر حصہ تاریخ ادب کی کتاب سے غیر متعلق ہے۔ یہ صرف چند تاریخی اور کچھ مفروضہ یادداشتوں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اسمیں ایسی بحثیں آگئی ہیں اور ان کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ وہ کسی پس منظر کو نمایاں کرنے کے بجائے، ایک خاص اندازِ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں، جس کو تاریخ ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً اس باب کے آخری ۹ صفحے اورنگزیب کے نظام حکومت کی خامیوں کے مفصل بیان پر مشتمل ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ زبان و ادب پر اور لوگوں کے ذہن و مزاج پر ان حالات کے کیا اثرات پڑے۔ اس خامی کی بنا پر، یہ حصہ، محض مقالہ نگار کے ذوقِ تاریخ نگاری کا مظہر ہو کر رہ گیا ہے۔

اس حصے میں مال گزاری وصول کرنے کے طریقے، زمین کی تقسیم منصب داروں اور افسروں کی درجہ بندی، شیواجی کی آویزش، مندروں کا انہدام، امتیازی محصول اور اسی قبیل کے واقعات و احوال کو تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے، جو بظاہر کتاب سے بالکل غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں ۹ صفحات پر مشتمل یہ حصہ درحقیقت اورنگزیب کے خلاف پیش کی گئی فردِ جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا اس کتاب سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا ہر بات کا کسی دوسری غیر متعلق بات سے ہو سکتا ہے۔ آج کل جو ایک انداز ہے کہ اصل موضوع سے زیادہ۔ پس منظر کو یا دوسری غیر متعلق

باتوں کو پیش کیا جائے، خواہ ہاتھی سے اس کی دم بڑھ جائے۔ وہی صورت یہاں پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے علاوہ، کچھ ایسی باتیں بھی لکھی گئی ہے، جن کو بطور کلیہ ماننا ممکن نہیں ہے۔ ایسی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ ص ۶۲ پر علاءالدین خلجی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اس کے احکام اخلاقی نقطہ نظر سے قابلِ سرزنش ہوں تو ہوں مگر ان سے تدبیر اور دوراندیشی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ احکام یہ تھے۔

کاشتکاروں کو بالکل نہ ستایا جائے۔ سپاہی جو چیزیں خریدیں اس کے دام ادا کریں۔ اور ملک گیری کی کوئی کوشش نہ ہو۔"

ملاحظہ فرمایا! کاشتکاروں کو نہ ستانا، چیزوں کے دام ادا کرنا اور ملک گیری کی کوشش نہ کرنا، ایسے احکام ہیں جو "اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ سرزنش" ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ احکام اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ سرزنش ہیں، تو پھر قابلِ تحسین احکام یہ ہوں گے کہ کاشتکاروں کو ستایا جائے۔ چیزوں کے دام نہ دئیے جائیں اور ملک گیری کی کوشش کی جائے!!

۲۔ ص ۷۰ پر لکھا ہے۔ "ایک اور تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بابر ماہر جنگ ہونے کے باوجود ایک بلند سیرت اور تربیت یافتہ ذہن رکھتا تھا۔"

گویا یہ کلیہ ہے کہ جو شخص ماہر جنگ ہوگا، وہ نہ بلند سیرت ہوگا نہ اس کا ذہن تربیت یافتہ ہوگا!! مقالہ نگار کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص اسے تسلیم کرے۔

۳۔ ص ۶۹ پر سلطنت مغلیہ کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے۔ "دہلی پر پانچ خاندانوں نے حکومت کی، مگر ان میں کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کے مورث چار یا پانچ پشت پہلے تک با اقتدار و ذمہ دار انسان رہے ہوں۔"

—— اسی سلسلے میں دو سطروں کے بعد لکھا ہے:—

لیکن یہ اعتراض کہ ان کے مورث غیر معروف الشان تھے مغل خاندان کے بانی بابر پر صادق آتا ہے۔ بابر کے مورث کئی نسلوں سے با اقتدار حکمران رہ چکے تھے۔ بابر باپ کی طرف سے تیمور کی نسل سے تھا اور ماں کی طرف سے چنگیز خاں کی نسل سے ..... بالآخر مسلمانوں کو بھی ایک ایسا حکمراں مل گیا جو شاہی نسل سے تھا اور جسے ہندوستان کے سورج بنسی اور چندر بنسی راجاؤں کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا تھا۔"

بابر پر اس اعتراض کا صادق آنا کہ "اس کے مورث غیر معروف الشان تھے"، اور پھر یہ لکھنا کہ "بابر کے مورث کئی نسلوں سے با اقتدار حکمراں رہ چکے تھے۔" تضادِ بیان کا آئینہ دار ہے۔

۴۔ ص ۷۴ پر جہانگیر کے متعلق لکھا گیا ہے۔ "وہ فارسی نثر کا ایک صاحب طرز مصنف تھا۔" میرا خیال ہے کہ مقالہ نگار کے علاوہ اور کسی کو یہ بات نہیں معلوم ہوگی کہ جہانگیر صاحبِ طرز نثر نگار تھا۔ اچھا نثر نگار ہونا اور صاحب طرز نثر نگار ہونا، دو مختلف باتیں ہیں مقالہ نگار نے جوشِ تعریف میں، دونوں کو ایک سمجھ لیا ہے۔

۵۔ ص ۷۹ پر، اورنگزیب کے جرائم کا ذکر کرتے ہوئے، مقالہ نگار نے اسلامی آئین کو بھی ہدفِ طنز و تعریض بنانے کا موقع نکال کر اپنے مخصوص اندازِ نظر کی نمائش کی گنجائش پیدا کرلی۔ فرماتے ہیں:

اس تخت نشینی کی جنگ میں اورنگزیب کامیاب رہا اور اس نے اپنے دو بھائیوں کو قتل کرلیا اور تیسرے بھائی شجاع کو اراکان بھاگنے پر مجبور کیا، جہاں جاکر وہ مرگیا۔ اس نے اپنے بھتیجوں کو بھی قید کردیا۔ ساری کارروائی مسلم آئین حکمرانی کے مسلمہ اصول کے مطابق ہوئی"؛

ہندوستان میں مختلف مسلمان خاندانوں نے حکومت کی ہے لیکن انکی حکومت کو اسلامی حکومت نہیں کہا جاسکتا۔ اورنگزیب نے یا دوسرے مسلمان بادشاہوں نے جو کچھ کیا، وہ اس دور کے نظامِ بادشاہت کا نتیجہ تھا۔ اس کو "مسلم آئین حکمرانی کے مسلّمہ اصول" کہنا، دراصل مسلم آئین حکمرانی پر طنز کرنے کا ایک بہانہ پیدا کرنا ہے جو مقالہ نگار کا محبوب مشغلہ ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل لکھا جاچکا ہے، ان کو حق ہے کہ وہ مسلم آئین حکمرانی کی قباحتوں پر پوری کتاب لکھ دیں، لیکن تاریخ ادب کی کتاب کو ایسی غلط بیانیوں سے آلودہ نہیں کرنا چاہئیے۔

مقالہ نگار سے یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا غیر مسلم حکمرانوں نے کبھی اس "جرم" کا ارتکاب نہیں کیا؟ اگر کیا ہے تو کیا اسے "غیر مسلم آئین حکمرانی کے مسلّمہ اصول" کہنا جائز ہوگا؟

۶۔ ص ۷۶ پر حضرات شیخ معین الدین چشتی رح قطب الدین بختیار کاکی رح فرید الدین گنج شکر رح نظام الدین اولیاء رح اور نصیر الدین چراغ دہلی رح کے بارے میں لکھا ہے۔ "ان کی زندگی کا دار و مدار "فتوح" پر تھا یعنی ان مانگی خیرات پر، جو پڑوسی ہوسے دیں۔"

ان ملبند پایہ صوفیہ کی خدمت میں انتہائے عقیدت و احترام اور جذبۂ خدمت گزاری کے تحت جو کچھ پیش کیا جاتا تھا، اسکو "خیرات" سے تعبیر کرنا، یاوہ گوئی کی انتہا ہے۔ پھر یہ ستم کہ لفظِ فتوح لکھ کر اس کا ترجمہ خیرات کیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یا تو مقالہ نگار اور نظر ثانی کرنے والوں کو لفظِ فتوح اور لفظ خیرات، دونوں کے معنی نہیں معلوم ہیں؛ اور نہ وہ ان صوفیہ کے احوال سے کما حقہٗ واقف ہیں یا مقالہ نگار نے قصداً اپنے معتقدات کے زیر اثر، بطور تعریض اس لفظ کو لکھا ہے۔ اور نظر ثانی کرنے والوں نے اس کو برحق سمجھا ہے

۷۔ ص ۷۲ پر اکبر کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"شروع میں وہ ایک معمولی حنفی مسلمان تھا جس کا خیال تھا کہ وہ مسلم علما کو متنازعہ فیہ مسائل پر متحدہ کرسکتا ہے ..... مگر علما کا اختلاف بڑھتا ہی گیا۔ اس خرابی کو دور کرنے کی غرض سے شیخ مبارک (ابوالفضل اور فیضی کے والد) نے ۱۵۷۹ء میں ایک محضر تیار کیا، جسے یورپین علما نے غلطی سے (INFALLIBILITY DECREE) بتایا ہے۔ یہ دستاویز جس پر اس دور کے سارے ممتاز علما نے دستخط کئے تھے، کسی طرح اکبر کو پوپ کا درجہ نہیں دیتی۔ نہ وہ اکبر کو کوئی ایسا اختیار دیتی ہے جو اس سے پہلے مسلمان بادشاہوں نے نہ برتا ہو۔ . . اس محضر میں کوئی نئی بات نہیں ہے مگر اسے اکبر کی تلاش حق کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے"

اس کے علاوہ، کہ یہ اقتباس اور اس کے بعد کی کچھ عبارت، غلط بیانیوں کا مجموعہ ہے، سوال یہ ہے کہ اس کا اصل موضوع سے کیا تعلق ہے؟ کیا اس حد درجہ اختلافی مسئلے کا ذکر کئے بغیر، اس دور کی وہ تہذیبی و سیاسی اہمیت واضح نہیں کی جاسکتی تھی، جس کا زبان کے آغاز وارتقا سے تعلق ہے؟ یہ بات ظاہر ہے کہ مقالہ نگار نے محض اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے اظہار کے لئے، اس کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے، ورنہ اصل موضوع سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

مقالہ نگار کا یہ لکھنا کہ اس محضر میں کوئی نئی بات نہیں ہے مگر اسے اکبر کی تلاش حق کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے، حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ سارے ممتاز علما نے اس محضر اجتہاد پر دستخط کئے تھے۔ محضر اجتہاد اور دین الٰہی دونوں، اکبر کے جذبۂ تلاش حق سے زیادہ، شیخ مبارک کی خاص قسم کی ذہنیت اور ذہانت اور جذبۂ انتقام کے مظہر تھے۔ بہرحال یہ اختلافی مسئلہ ہے اور طویل بحث کا موضوع بنا بھی ہے اور بن بھی سکتا ہے۔ اس کتاب میں اس کا بالکل ذکر نہیں ہونا چاہئے تھا۔

اس کتاب میں جو اشعار درج کئے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر غلط ہیں۔ کچھ مضمون نگاروں کی بے احتیاطی کا شکار ہوئے ہیں، کچھ پریس والوں کی کرم فرمائی کے سبب سے مسخ ہوئے ہیں۔ پڑھنے والوں کے لئے بہر صورت گمراہی کا خاصا سر وسامان جمع ہوگیا ہے۔ یہی نہیں بہت سے مصرعے صریحاً ساقط الوزن ہیں۔ اس سے مضمون نگاروں کی بالغ نظری کے ساتھ ساتھ۔ نظر ثانی کرنے والوں کی رسائی اور احساسِ ذمے داری کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بطور "مشتی نمونہ از خروارے" دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ص ۲۸ پر برہمن سے جس غزل کو منسوب کیا گیا ہے، اس میں دو مصرعے صریحاً ساقط الوزن ہیں۔ یہاں نہ علامت استفہام ہے نہ کذا۔ اس سے بلا تکلف یہ مانا جاسکتا ہے کہ مضمون نگار اور نظر ثانی کرنے والے، دونوں کی رائے میں یہ مصرعے بجائے خود درست ہیں۔ وہ مصرعے یہ ہیں:

ع خدا جانے کس شہر اندر ہمن کو لاکے ڈالا ہے

ع پیا کے ناون عاشق قتل با عجب دیکھے ہوں

دوسرا مصرع صریحاً بے معنی بھی ہے۔

ص ۴۰ پر، قزلباش خاں امید سے ایک غزل کو منسوب کیا گیا ہے، اس میں یہ مصرعے بھی ہیں، جن کا غلط ہونا عیاں ہے

ع بامن کی بیٹی ایک مری آنکھ میں کھڑی

ع رفتم بہ پیش و گفتم جانم فدائے تست

ع ایسی نہ سیتا اور نہ بھوانی رادھکا

ص ۷۹ پر، نصیرالحق کا ایک شعر اس طرح لکھا ہوا ہے:

گیارہ سو اوپر باون ہوئے جب

لکھا گوجری منیں یہ قصا تب

دوسرا مصرع صریحاً غلط ہے۔

ص ۱۰۳ پر نصرتی کی تاریخ وفات کا قطعہ اس طرح درج ہے۔

ضرب شمشیر سوں یو دنیا چھوڑ

جا کے جنت میں خوش ہوا ہے

سالِ تاریخ آ ملایک نے

یوں کہے نصرتی شہید رہے

دوسرا اور چوتھا مصرع، دونوں غلط ہیں

ص ۵۰۲ پر ایک غزل کے ان اشعار میں، دوسرا اور تیسرا مصرع بالیقین غلط ہے:

گیسوے تاب دار ہیں یا ناگ ہے بھونگ
یا زلف مشک رنگ ہے نافۂ ختن
چون ماہتاب روے او کرتا ہے جھمک جھمک
یا آفتاب گشتہ درخشندہ درگگن

"تاریخی حقائق اور عہد بہ عہد کے ارتقائے زبان وادب کے متعلق خود مرتبین کی معلومات کتنی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرتب اعلائے کتاب کی تمہید میں، پہلے ہی پیراگراف میں لکھا ہے:

"تذکروں میں شعرا عام طور پر حروفِ تہجی کے اعتبار سے لئے گئے ہیں، آبِ حیات میں سب سے پہلے ہمیں تاریخی ادوار کا التزام ملتا ہے۔"

جس شخص نے قائمؔ کا تذکرہ، میر حسنؔ کا تذکرہ اور کریم الدین کا تذکرہ دیکھا ہے، وہ کسی قید یا صراحت کے بغیر، یہ لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اِن تذکروں میں ادوار قائم کئے گئے ہیں؛ آبِ حیات کی طرح نہ سہی۔ قائم وکریم الدین کے تذکروں میں تو حرفِ تہجی کا مطلق لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ میر حسنؔ کے تذکرے میں بھی اور تذکروں کی طرح حروفِ تہجی کی پابندی نہیں کی گئی ہے، بلکہ طبقات کے ذیل میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

کتاب میں یکسانیت اور صراحت کو کم سے کم ملحوظ رکھا گیا ہے ناموں کے آگے قوسین میں سنین درج ہیں۔ اس سلسلے میں کسی ایک قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ کہیں یہ سنین سنہ ولادت وفات کو ظاہر کرتے ہیں، کہیں زمانہ حکومت کو، صراحت نہ یہاں ہے نہ وہاں مثلاً ص ۴۷۱ پر شیخ حمید الدینؒ ناگوری کے نام کے آگے (۱۲۷۴ -

۱۱۹۳ ؁ ۱۲۱۶) لکھا ہوا ہے، یہ سنہ ولادت ووفات پر حاوی ہے۔ لیکن اسی صفحے پر (اور ناموں کے علاوہ) علاء الدین خلجی کے نام کے آگے (۱۲۹۵ - ۱۳۱۵ء) لکھا ہوا ہے۔ یہ سنہ، عہد حکومت پر حاوی ہے۔ مقدمے میں یا کہیں اور اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے، کہ کس جگہ سنین کس مدت پر حاوی ہوں گے۔

بہت سے مقامات پر سنینِ ہجری وعیسوی دونوں درج کئے گئے ہیں۔ یہ نہایت مناسب انداز ہے۔ لیکن بہت سے مقامات پر صرف سنینِ عیسوی درج ہیں یا صرف سنینِ ہجری۔

متعدد مقامات پر نام کے آگے قوسین میں ایک سنہ لکھا ہوا ہے، اور اس کی صراحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ سنہ ولادت ہے یا سنہ وفات مثلاً ص ۱۶۴ پر لکھا ہوا ہے۔ "شاہ کمال گرم گنڈوی کڑپہ (۱۲۲۴ھ - ۱۸۰۹ء) نے ان کو اورنگ آبادی لکھا ہے۔" یہاں یہ صراحت نہیں کی گئی کہ یہ سنہ ولادت ہے یا سنہ وفات۔ محض قیاساً اس کو سنہ وفات سمجھا جا سکتا ہے، جب بہت سے مقامات پر لفظ متوفی یا اور کوئی تصریحی لفظ لکھا ہوا ہے۔

متعدد مقالہ نگاروں نے ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر، کچھ اہم باتیں لکھی ہیں۔ تحقیق کے نقطۂ نظر سے، ایسے کسی دعوے کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ ص ۷۶ پر ایک مقالہ نگار نے حضرات شیخ معین الدین چشتیؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ، فرید الدین گنج شکرؒ، نظام الدین اولیا اور نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"انھوں نے کوئی تصانیف نہیں چھوڑیں۔ جو تصانیف ان کے نام منسوب ہیں۔ وہ سب بہت بعد کی ہیں اور جعلی ہیں۔"

مقالہ نگار نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے، اس لئے پڑھنے والا یہ فیصلہ کر ہی نہیں سکتا کہ یہ قول قابلِ اعتبار ہے یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ فاضل مقالہ نگار کا ماخذ کیا ہے، لیکن جن لوگوں نے حضرت گنج شکرؒ اور دوسرے بزرگوں کی تصانیف سے انکار کیا ہے، ان کے انکار کی بنیاد حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مجموعہ ملفوظات خیر المجالس کے ایک ملفوظ پر مبنی ہے، جو درج ذیل ہے:

" بعد ازاں فرمودند کہ خدمت شیخ نظام الدین می فرمود کہ من ہیچ کتابی نہ نوشتہ ام زیرا کہ خدمت شیخ الاسلام فرید الدین و شیخ الاسلام قطب الدین و خواجگانِ چشت قدس اللہ ارواحہم و از مشائخ شجرۂ ما ہیچ یکی تصنیف نہ کردہ است۔ بندہ عرضداشت کرد کہ در فوائد الفواد آمدہ است کہ شخصی بخدمت شیخ الاسلام شیخ نظام الدین قدس اللہ سرہ العزیز عرضداشت کرد کہ من بر شخصی کتابی دیدہ ام از تصنیف شیخ۔ خدمت شیخ فرمودند۔ او تفاوت گفتہ است۔ من ہیچ کتابی تصنیف نکردہ ام و خواجگانِ ما نیز نکردہ اند۔ خواجہ سلمہ فرمودند آری خدمت شیخ ہیچ کتابی تصنیف نکردہ است۔"

(خیر المجالس ص ۵۳۔ شائع کردہ شعبۂ تاریخ علی گڈھ یونیورسٹی)

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اس موقع پر تقاضائے احتیاط یہ تھا کہ مقالہ نگار ماخذ کے حوالے کے ساتھ ساتھ یہ صراحت بھی کر دیتے کہ اس سے ان کی مراد ملفوظات کی صحتِ انتساب کی نفی سے نہیں ہے، کیونکہ یہ قول جس کی بنا پر دوسرے بزرگوں کی تصانیف سے انکار کیا جاتا ہے، خود ایک مجموعۂ ملفوظات پر مبنی ہے اگر یہ مجموعے بھی ان بزرگوں سے منسوب نہیں کئے جا سکتے ہیں، تو پھر اس انکار کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔

ایک اور پریشان کن صورت حال یہ ہے کہ مقالہ نگاروں نے صحتِ انتساب کا قطعی فیصلہ کئے بغیر، اس کلام سے اردو کے آغاز و ارتقا کے متعلق کچھ نتائج اخذ کئے ہیں، جس کا انتساب ہنوز محتاج ثبوت ہے۔ اس ذیل میں امیر خسرو، خواجہ گیسو دراز رح برہمن اور بعض دوسرے لوگ آتے ہیں۔ جب یہ ثابت نہ ہو جائے کہ کون سی کتاب واقعی کس کی ہے، یا کس کلام کو واقعۃً کس سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی ایک مقالہ نگار، حضرت خواجہ گیسو دراز رح کی تصنیفات ۱۵، ۲۰ صفحے سیاہ کرنے کے بعد بھی، یہ ثابت نہیں کر سکے ہیں کہ یہ ساری تصنیفات واقعی انھیں کی ہیں۔ البتہ نتائج بڑی فراخدلی سے نکال لئے ہیں۔

بے پروائی و بے احتیاطی کا عالم یہ ہے کہ افراد و کتب کے نام مختلف مقامات پر مختلف ہیں۔ مثلاً ص ۴۸ پر ایک جگہ ایلتمش لکھا ہوا ہے، اسی صفحے پر دوسری جگہ التمش ہے اور ص ۴۹ پر التمش۔ صفحات ۲۱۰، ۲۷۸، ۲۸۱، ۳۰۱، ۳۱۱، ۳۳۶ پر

ایک کتاب کا نام "بساتین السلاطین" لکھا ہوا ہے۔ ص ۳۳۴ پر "بساطین السلاطین" درج ہے۔ اور یہی انڈکس میں ہے۔

خانِ آرزو کے ایک لغت کا نام نوادر الالفاظ بھی لکھا ہے (ص)، تصحیح غرائب اللغاتِ ہندی بھی (ص ۲۵) اسی غرائب اللغات ہندی کو دوسری جگہ غرائب اللغات عبد الواسع ہانسوی لکھا گیا ہے (ص ۴۲)

ص ۱۹۸ پر ایک کتاب کا نام برہان مآثر لکھا ہوا ہے ص ۲۷۸ پر برہان معاثر اور انڈکس میں برہان ماثر ہے۔

فارسی کے مشہور لغت مؤید الفضلا کا نام ایک جگہ صحیح لکھا ہوا ہے، ایک جگہ مرید الفضلا ہے (۱۹) اور ایک جگہ مؤید الفضل (ص ۵۱۲)

کتاب میں اکثر مقامات پر نصیر الدین چراغ دہلی، یا روشن چراغ دہلی، لکھا ہوا ہے۔ لیکن ایک مقالے میں میں جگہ "نصیر الدین چراغ" لکھا ہوا ہے (ص ۶۶ - ۶۷) یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چراغ ان کا تخلص ہو۔

عبد الحق صاحب کی معروف کتاب کا نام کہیں تو "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" لکھا ہوا ہے (مثلاً ص ۱۴۴) اور کہیں "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ (مثلاً ص ۴۸، ۱۸۹)

کتاب میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔

بے احتیاطی کی انتہا یہ ہے کہ صحیح لفظ کو غلط بتا کر، اس کی تصحیح کی ہدایت کی گئی ہے۔ ص ۱۹۶ پر تیسری سطر میں برہان الدین جانم لکھا ہوا ہے۔ یہ بالکل صحیح نام ہے۔ لیکن کتاب کے آخر میں جو غلط نامہ ہے، اس میں ہدایت کی گئی ہے کہ یہاں جانم کے بجائے حاتم لکھا جائے۔ غلط نامے کا مصرف تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ جو غلطیاں کتاب میں رہ جائیں۔ ان کی تصحیح کر دی جائے۔ یہ فخر اس اس کتاب کے مرتبین ہی کو حاصل ہے کہ انہوں نے صحیح لفظ کو غلط کرانے کے لئے بھی اس کو استعمال کیا ہے۔

اغلاطِ طباعت کی کثرت نے رہی سہی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے غلطیوں کی بہتات سے گمان یہ ہوتا ہے کہ پروف پڑھے ہی نہیں گئے ہیں۔ ان کے فیض سے مطمئن کے بجائے مطمعن (ص ۵۲) شکست کے بجائے شکشت (ص ۵۳، ص ۵۵)، ملک الشعرائی کے بجائے

ملک الشعرائی (ص ۱۹۱) ضیاء الدین کے بجائے، صیاء ا لدین (ص ۶۹) البیرونی کے بجائے، البیرنی (ص ۸۸) شروانی کے بجائے، شیروانی (ص ۴۷، ص ۹۴) لنگوٹک کے بجائے، لنگوٹکک (ص ۹۴) اور اسی قسم کے بلا مبالغہ سیکڑوں لفظ ہیں، جن کی صورت بدلی گئی ہے۔

اور لفظ سنہ کے بجائے تو تقریباً ہر جگہ سَن چھپا ہوا ہے، ہاں اغلاطِ پریس کی کثرت سے یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ مقالہ نگار، مرتبین اور کارکنانِ پریس، سب کی کارکردگی میں توازن پیدا ہو گیا ہے۔

اس کتاب کا سب سے زیادہ مضحکہ خیز حصہ، اس کا اشاریہ ہے اس قدر جہالت مآبی کے ساتھ، کسی کتاب کا اشاریہ مرتب نہیں کیا گیا ہوگا۔ حیرت ہوتی ہے کہ نظر ثانی کرنے والوں نے اس بھیو ہڑن کو کس طرح قابلِ قبول سمجھا اور کسی جاہل محض کو یہ خدمت کیسے سپرد کر دی ؟

معلوم ہوتا ہے کہ اشاریہ مرتب کرنے والے بزرگ نے، کسی قاعدے کا لحاظ رکھنا، اپنے لئے حرام سمجھا تھا۔ جس لفظ کو جہاں چاہا ہے اور جس طرح چاہا ہے، لکھا ہے۔ میں اس لپشتارۂ اغلاط میں سے دو چار مثالیں پیش کرتا ہوں۔ پورا اشاریہ اسی قسم کی خوش فعلیوں کی جولانگاہ ہے :

ص ۴۷۱ پر غیاث الدین تغلق اور غیاث الدین بلبن کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے غیاث الدین تغلق کو تو حرف غ کے ذیل میں لکھا گیا ہے اور غیاث الدین بلبن کو حرف ب کے ذیل میں۔

شاہ وجیہ الدین کا نام حرف د کے ذیل میں درج ہے۔ لیکن شاہ شریف محمد گرانی، شاہ ہاشم بیجاپوری، وغیرہ کا نام، حرف ش کے ذیل میں لکھا ہوا ہے۔ شیخ جمالی، شیخ علائی، شیخ نوری وغیرہ کے نام حرف ش کے ذیل میں درج ہیں لیکن شیخ علی محمد، شیخ عزیز اللہ، شیخ عیدی کے نام حرف ع کے ذیل میں لکھے گئے ہیں۔ اور شیخ معین الدین چشتی اجمیری کا نام الف کے ذیل میں ملیگا

اشاریے میں ترتیب حروف کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ خصوصاً حرف اول و ثانی میں۔ اس کتاب کے "اشاریہ ساز" نے اس مسلّمہ قاعدے کو مہمل سمجھ کر، ساری پابندیوں کو اڑا دیا ہے۔ اور جس لفظ کو جہاں چاہا ہے، لکھا ہے۔ مثلاً ع کے ذیل میں۔ سب سے پہلا نام علی ہے، دوسرا علاؤ الدین، اس کے بعد عثمان ہے، پھر عبد الواسع عبد الحکیم، عبدی ہیں۔ اچانک عمر، عصامی، عزیزی، سامنے آتے ہیں پھر عنبر اور اس کے معاً بعد عباس اور اس کے بعد عادل، (جس کو سب سے پہلے آنا چاہیئے تھا)

یہی نہیں، اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی ہے کہ اصل کتاب اور اشاریے میں مطابقت بھی ہو۔ کتاب کے ایک صفحے پر ایک نام موجود ہے، اشاریہ اس سے خالی ہے۔ اشاریے میں لکھا ہوا ہے کہ یہ نام فلاں صفحے پر ہے، لیکن وہ صفحہ اس سے خالی ہے مثلاً اشاریے میں حرف ق کے ذیل میں، خواجہ محمد دہدار فانی کے نام کے آگے صفحات ۱۴۶ اور ۲۴۸ کا حوالہ دیا گیا ہے ــ لیکن ص ۱۴۶ اس نام سے خالی ہے ــ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے نام کے آگے جن صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں ص ۲۷ بھی ہے، لیکن یہ صفحہ آپ کے نام سے محروم ہے۔ شاہ برہان الدین غریب کے نام کے آگے کئی صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ان میں ص ۴ بھی ہے لیکن اس صفحے میں یہ نام موجود نہیں ہے۔ البتہ برہان الدین اولیا کا نام لکھا ہوا ہے۔ جس سے اشاریہ خالی ہے۔

اشاریے میں شیخ شرف الدین یحیی منیری کا نام حرفِ ی کے ذیل میں لکھا گیا ہے، اور اس کے آگے صرف ص ۲۷۷ کا حوالہ دیا گیا ہے، جب کہ یہ نام ص ۴۷۷ پر بھی موجود ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب صورت حال یہ ہے کہ ایک ہی کتاب یا شخص، دو مختلف ناموں سے دو جگہ درج ہے۔ مثلاً حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا نام حرف ر کے ذیل میں روشن چراغ دہلی کی رعایت سے ملے گا اور حرف ن کے ذیل میں بھی ملے گا۔ غالباً پریس کی غلطی سے مشہور لغت موید الفضلا کا نام ص ۱۹ پر مرید الفضلا لکھا ہوا ہے۔ اشاریے میں بھی ان کو دو کتابیں فرض کر کے، دو جگہ لکھا گیا ہے۔

غرض کہاں تک مثالیں لکھی جائیں، اس بحر بیکراں کے لئے تو سفینہ چاہیئے۔ بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ نظر ثانی کرنے والوں نے کیا کیا ہے ؟ یہ بات تو سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کسی ناواقف محض شخص کو، محض ازراہِ پرورش، اس کام کے لئے منتخب کر لیا گیا لیکن ان حضرات نے کیا کسی کے کام کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا ؟ ؟

کسی قابلِ ذکر ادبی کتاب میں اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ صحیح بلکہ فصیح زبان کا وجود بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ غیر مناسب اندازِ بیان اور غلط جملے، اس بہتات کے ساتھ اس کے صفحات میں محفوظ ہیں کہ بعض نئے لکھنے والوں کی کئی کتابیں مل کر بھی، اس کی برابری کا دعویٰ بہ مشکل کر سکتی ہیں۔

کتاب کے شروع میں نگرانِ اعلا، سرور صاحب کی لکھی ہوئی تمہید شامل ہے، جو سات صفحوں پر مشتمل ہے۔ ان سات صفحوں میں جیسے عجیب الخلقت جملے لکھے گئے ہیں، وہ دیدنی ہیں، میں بطور نمونہ دو تین جملے پیش کرتا ہوں۔ جن لوگوں کے ذمے نظرِ ثانی اور دیکھ بھال کا فرض ہے، وہ خود اگر غلط نویسی میں تکلف نہیں کرینگے۔ تو مآل کیا ہوگا۔ یہ پہلو اس لحاظ سے اور زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ طلبہ، جب ایسی اہم کتاب میں (جو ان کی نظر میں معتبر بھی ہوگی) ایسے جملے پڑھیں گے۔ تو یہ غلط نگاری، ان کے لئے سند کا کام دے گی۔ اور اس کی مضرت محتاجِ بیان نہیں۔

(۱) "اس تاریخ کی پہلی جلد میں ایک لسانیاتی مقدمہ دیا گیا ہے۔" "مقدمہ دیا گیا ہے" لکھنا، صحتِ زبان پر ستم کرنا ہے۔

(۲) جدید اصولوں کی روشنی میں کام کرکے، ہماری تاریخ کے کئی "تاریک گوشوں سے نقاب اٹھایا تھا"۔ تاریک گوشوں سے نقاب اٹھانا، "تاریکی کو پیش کرنے کے مرادف ہے۔ اس سے یہ مراد لینا کہ تاریک گوشوں کو روشن کیا تھا، الٹی بات ہوی۔

(۳) "تذکروں میں شعرا عام طور پر حروفِ ہجی کے اعتبار سے لئے گئے ہیں۔" "تذکروں میں شعرا لئے گئے ہیں، لکھنا صحتِ زبان کا خون کرنا ہے۔

(۴) "خام مواد کو تاریخی پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ ورنہ یکطرفہ ہو جانے کا امکان ہے"۔ یکطرفہ ہو جانے سے، جانبدار ہو جانا مراد لینا بھی اسی قبیل کی بات ہے۔

اسی بے نیازی کا یہ فیض ہے کہ یہ کتاب اس قسم کے غلط جملوں سے بھری ہوئی ہے: "جن کی لغت پر خانِ آرزو نے تصحیح کی ہے"۔ (ص ۸۳) "خاندانی شجرہ میں ولی کا نام شاہ ولی اللہ دیا ہوا ہے"۔ ص ۹۱ (۱۴) "مذکورہ بالا اسباب میں بعض احمد نگر میں مہیا تھے اور بعض نہ تھے"۔ (ص ۱۹۷) "انہوں نے قصداً بھنگ کا پیالہ منگوایا عالمگیر نے اس کو دیکھا کہ وہ دراصل دودھ ہو گیا ہے"۔ (ص ۳۰۹) "لیکن یہ ان کی اکلوتی تصنیف نہیں ہوگی، اور بھی نظمیں رہی ہوں گی۔" (ص ۲۵۰) "مگر وہ جوش و جودت نہیں ہے جو "سب رس" کی ایک ایک سطر کی خصوصیت ہے۔" (ص ۴۷۹) "ان کے لئے ملک کی مقامی زبان سیکھنا ناگزیر تھی"۔ (ص ۶۶) "راؤ سجن سنگھ نے اچھے شرائط پر صلح کی درخواست کی، جن کو اکبر نے منظور کر لی۔" (ص ۴) "مغل سلطنت کے تعلقات ہندو راجواڑوں سے جن شرائط پر طے ہوئے" (ص ۱۷) "ہندوستان سے تیل، شکر، سوتی کپڑے، اور ریشم جاتے تھے"۔ (ص ۵۲) "قیمتیں مقرر کرنے کی بنیاد پیدائش کی لاگت کے اصول پر تھی"۔ (ص ۶۳)

موجودہ حالات کے پیشِ نظر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اب مدت تک ہندوستان میں کسی اور ادارے سے ایسی کتاب کا شائع ہونا، ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ یا ربار اس قدر وسائل ہاتھ نہیں آتے، نہ حالات اتنی مساعدت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کا اس قدر بے احتیاطی کی روشنی میں مرتب کیا جانا، اور زیادہ افسوسناک ہے۔

یہ کتاب، علی گڑھ یونیورسٹی کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے اور طلبہ کو گمراہ کرنے کی منظم کوشش۔ تاریخِ ادب کی کتاب میں لکھے ہوئے کسی واقعے کا اگر حوالہ دیا جا سکے، اس میں درج شدہ تاریخوں پر اعتبار نہ کیا جا سکے، اس کے اقتباسات کی صحت مشکوک ہو، جن تحریروں سے زبان کے آغاز و ارتقا پر استدلال کیا گیا ہو ان کا انتساب ہی محتاجِ ثبوت ہو اور تضاد بیان سے پوری کتاب بھری ہوئی ہو، تو آخر اس کتاب کا مصرف کیا ہوگا؟

ابھی اس کی باقی جلدیں نہیں چھپی ہیں۔ میں اربابِ اختیار سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ طلبہ کی بے چارگی اور اردو کی بے مائگی پر رحم کھا کر، ان جلدوں کو طومارِ اغلاط اور متضاد بیانات کا مجموعہ نہ بننے دیں۔ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو نظرِ ثانی کے لئے آمادہ کیا جائے، جو واقعی اس کا اہل ہو۔ تاریخ و تحقیق میں لفظوں کے طوطا مینا بنانے سے کام نہیں چلتا ہے۔

اعمال حزب البحر

مادی عقلوں کو حیران کرنے والے ہتھیار ہیں جن کو ساری دُنیا کی قوموں نے آزما کر سچا پایا ہے تسخیر حکام تسخیر خلائق تسخیر اہل خانہ ہلاکئ اعداء ادائیگی قرض حصولِ اولاد صحت جسم رہائی اسیر ترقی رزق ۔ افزونی عزت وجاہ ۔ معرفتِ حق ۔ قلب کی صفائی ۔ غرض دین ودنیا کے ہر کام کیلئے اعمال حزب البحر کو استعمال کیجئے جنھیں سلطان المشائخ حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے جانشین امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے اور ان کی بابت مصر ۔ شام بیت المقدس ۔ مراکو وغیرہ کے دلچسپ مشاہدات اور حضرت مولانا شاہ بدر الدین صاحب پھلواروی اور حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلوارویؒ اور حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ کے ارشاداتِ عالیہ کو بھی درج کیا ہے ۔

نئے ایڈیشن میں اعمال کا اضافہ

اعمال حزب البحر کے نئے ایڈیشن میں ان خاص الخاص اور راز کے اعمال کو بھی درج کیا گیا ہے جن کو مشائخ برسوں خدمت لئے بغیر ظاہر نہیں کرتے ۔ پانچ نئے اعمال سورۂ فاتحہ کے ہیں اور سات بے مثل اعمال سورۂ بقر کے ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ تقدیر بدلنے کا عمل بھی لکھا گیا ہے جو حضرت خواجہ صاحب نے ۱۹۴۶ء میں خاص خاص محرم راز اشخاص کیلئے قلمبند کیا تھا ۔ پوری کتاب کا ہدیہ دو روپے علاوہ محصول ڈاک ۔

"حزب البحر کے عمل اور تعویذ"

اعمال حزب البحر کا دوسرا حصہ ہے ۔ اس میں استخارہ ۔ قہر دشمن ۔ تسخیر حب یقینی ۔ حصول اولاد ۔ درواندے کی برکت ۔ حصار رد سحر ۔ رفیق نسواں ۔ نظر کا تعویذ ۔ دفع زہر ۔ مشاہدہ حق وغیرہ بہت سے اعمال اور صفائی قلب ۔ لباس تجلی ۔ ذہن کشا ترقی رزق ۔ ردِ مصائب حصارِ آفات ۔ تقویت عزم توبہ ۔ غیبی مدد ۔ یادِ حق وغیرہ نصاب وبے نصاب کی دعائیں تعویذ اور نقش وغیرہ لکھے گئے ہیں جو حصہ اول میں شامل نہیں ہیں ۔ حضرت خواجہ صاحب نے اس کتاب میں اعمال اور تعویذوں وغیرہ سے متعلق ستر ایسے راز بھی لکھے ہیں جو آج کل بڑے بڑے عالموں کو بھی معلوم نہیں ہیں ۔ نیز عملیات کا فلسفہ اور سائنس موجودہ زمانہ کے بے اطمینان دلوں کے لئے راحت اور تسکین احساس کا طریقہ اور رجعت اور دماغ خراب ہو جانے کا علاج بھی بیان فرمایا ہے ۔ ہدیہ ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک ۔ دونوں حصوں کا مجموعی ہدیہ تین روپے بمحصول ڈاک چودہ آنے ۔

نوٹ : پاکستانی حضرات تین روپے چودہ آنے کا منی آرڈر بنام محمد حسین نظامی ۵۲ میکلوڈ روڈ لاہور کو بھیجکر رسید ہمیں ارسال کر دیں کتابیں انکو دہلی سے روانہ کر دی جائینگی ۔

ملنے کا پتہ :- کارکن خواجہ اولاد کتاب گھر ۔ ڈاکخانہ حضرت نظام الدین ۔ نئی دہلی ۱۳

حسن نظامی سوسائٹی

کی جانب سے نواب میر احمد علی خاں صاحب وزیر تعمیرات واوقاف آندھرا پردیش کا

خیر مقدم

دلی ۳۰ر اکتوبر ۱۹۶۳ء - آج سہ پہر کو درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں آندھرا پردیش کے وزیر تعمیرات واوقاف نواب میر احمد علی خاں صاحب نے حاضری دی اور حسن نظامی سوسائٹی کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی جس میں مشائخ عظام حکومت کے کارکنان اور دلی کے بہت سے معزز ہندو مسلمان اور سکھ شہریوں نے شرکت کی۔

حسن نظامی سوسائٹی کے صدر مولوی فیاض الدین بہزاد دکنی نظامی۔ سکرٹری خواجہ حسن ثانی نظامی۔ خواجہ مہدی نظامی۔ خواجہ زبید نظامی سردار گوردت سنگھ جالی صدر آل انڈیا سکھ یوتھ لیگ اور لالہ انوپ سنگھ بینکر نے نواب صاحب موصوف کا استقبال درگاہ شریف کے مشرقی دروازے پر کیا۔ سب سے پہلے نواب صاحب موصوف حضرت خواجہ حسن نظامی حضرت امیر خسروؒ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزارات پر نہایت ادب اور احترام سے حاضر ہوئے۔ اور خواجہ حسن ثانی نظامی نے دستور کے موافق ان کو دستار اور دیگر تبرکات دیئے۔ حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر انوار پر نواب صاحب اور ان کے ساتھی مولوی باقر حسین صاحب قریشی منتظم نظام اسٹیٹ دیر تک فاتحہ خوانی اور دعا میں مصروف رہے۔ اور اس کے بعد انھوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ایک دیوار پر لکھے ہوئے علامہ اقبال مرحوم کی مشہور نظم

التجائے مسافر بدرگاہ محبوب الٰہی

کے یہ اشعار پڑھے:-

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے
محو اظہار تمنائے دل ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جن کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

دوسرے شعر میں ایک تلمیح ہے جس کو عام طور پر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے ایک بڑے چہیتے اور مقبول خادم خواجہ اقبال نامی تھے جنھوں نے ساری زندگی حضرت کی خدمت میں گزار دی۔ اور جن کا مرتبہ ایسا زبردست تھا کہ جن کی وہ سفارش کر دیتے تھے وہ بارگاہ محبوبی میں مقبول ہو جاتا تھا۔ ان کی سفارش کے بعد بہت سے بزرگ خلافت تک پر فائز ہوئے چنانچہ علامہ اقبال نے بھی اپنی التجا میں انہی کا حوالہ اور واسطہ دیا ہے کہ

لاج رکھ لینا کہ میں اقبال کا ہم نام ہوں

خواجہ حسن ثانی نظامی نے اس شعر کی تشریح کے ساتھ نواب صاحب کو خواجہ اقبال علیہ الرحمت کے مزار کی زیارت بھی کرائی جو حضرت امیر خسروؒ کے مزار کے مغربی رُخ واقع ہے

زیارت سے فارغ ہو کر نواب صاحب نے حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے حجرۂ قدیم میں قرآن مجید اور کتابیں دیکھیں۔ اور اس کے بعد استقبالیئے میں شریک ہونے والے معزز مہمانوں کے ساتھ چائے نوشی کی۔

نواب صاحب کے مزاج میں سادگی اور انکسار حد سے زیادہ ہے۔ اور درویشی محفلوں میں تو ان کا انکسار بہت ہی بڑھ جاتا ہے چنانچہ آج کے استقبالیے میں بھی اس کے کئی منظر نظر آئے کہ چائے نوشی

سے فارغ ہوکر نواب صاحب اور لالہ شام ناتھ جی ڈپٹی منسٹر انفارمیشن و براڈ کاسٹنگ صدر میں بیٹھنے کے بجائے۔ محافل کے آخری کنارے پر جا بیٹھے اور میزبانوں کے شدید اصرار کے بعد ہی وہاں سے اٹھے۔ لالہ شام ناتھ صاحب موجودہ زمانے میں دلی کی گنگا جمنی اردو تہذیب کا ایک نادر نمونہ ہیں۔ اور بزرگوں کے ادب احترام میں ان روایات کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں جو ہندوستان کی طبیعت قدیم کا ایک روشن پہلو ہیں۔ حافظ فیاض احمد صاحب انصاری وغیرہ قدیم کانگریسی اور قومی کارکنوں سے آج کی محفل میں وہ اس طرح جھک جھک کر مل رہے تھے کہ عظیم ہندوستان کے معزز نائب وزیر ہونے کے علاوہ مادر وطن کے ایک سعادت مند اور سپوت فرزند بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ایڈریس گلپوشی کے بعد خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے نواب صاحب کے اعزاز میں مندرجہ ذیل ایڈریس پڑھا:۔

محترم نواب میر احمد علی خاں صاحب! آج ہم سب سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے مزار کے پائین حسن نظامی سوسائٹی کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرنے جمع ہوئے ہیں۔ یہ جگہ صدیوں سے تارک دنیا فقراء اور درویشوں کا مرکز ہے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت آندھرا پردیش کے ایک معزز وزیر کے استقبال میں ہم سب کا جمع ہونا علامت ہے اس بات کی کہ کوئی چیز ہم درویشوں میں اور آپ جیسے وزیر میں مشترک ضرور ہے۔ اس وقت مجھے کسی بزرگ کا ایک مصرع یاد آرہا ہے۔ جو انھوں نے حضرت امیر خسروؒ کے بارے میں کہا تھا کہ

کمر بخدمت سلطان بہ بند و صوفی باش!

بادشاہ اور سلطان کی خدمت کرو اور اس کے باوجود صوفی رہو۔ آج سلطانی جمہور کا دور ہے۔ آج عوام بادشاہ ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ آپ نا برسوں سے ملک و قوم کی سیاسی اور سماجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور اس لیڈری کے باوجود درویشی صفات اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم سب کے دل جو سلطان المشائخ اور شہنشاہ دین حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہ سے نسبت رکھتے ہیں، اور جنھوں نے "شان خسرویؒ" کی تھوڑی بہت جھلکیاں دیکھی ہیں آپ کی طرف جھکنے لگے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم سب خلوص دل سے آپ کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

ہمیں آپ کی وضع داریوں اور استقلال اور حق شناسی اور خدمات اور ترک دنیا کا کچھ حال معلوم ہے کہ جاگیردار اور نواب ہونے کے باوجود زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کھادی پوش رہے۔ حالانکہ اس وقت آج کے بہت سے کھادی پوش کھادی اور سادگی کے نام سے بھی ناواقف تھے۔ اور کسی نام نمود کے بغیر آپ نے نہایت خاموشی سے اپنی خدمات کو جاری رکھا۔ اس کے علاوہ آپ وزارت تک نہیں گئے۔ بلکہ وزارت خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اب وزیر ہونے کے بعد بھی آپ کی وہی شان ہے کہ نہایت انکسار اور بے لوثی کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ چیز کہنے کو آسان ہے۔ لیکن حقیقت میں بہت مشکل ہے کہ

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

ایک ہاتھ میں جام شریعت اور دوسرے میں سندان عشق، ہر ہوسناک اس طرح جام اور لوہار کے سندان کو نہیں سنبھال سکتا۔ آپ نے اپنی ذات سے گاندھی جی کی روایات کو زندہ رکھا ہے۔ اور دوسری طرف ہم حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی شراب زندگی کے لذت چشیدہ ہیں۔ جو رات دن دنیا اور دنیا داروں میں رہنے کے باوجود بھی دنیادار نہیں بنے اور تصوف کی اعلیٰ اقدار کے علمبردار رہے۔ اسلئے آج ہمارا اور آپ کا یہاں مل بیٹھنا بڑا مبارک ہے!

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ ترک دنیا اس بات کا نام نہیں ہے کہ آدمی لنگوٹ باندھ کر جنگل میں بیٹھ جائے اور رات دن عبادت کرتا رہے۔ یہ کام تو ایک بوڑھی عورت بھی کر سکتی ہے۔ مردوں کا کام یہ ہے اور ترک دنیا اسے کہتے ہیں کہ کھاؤ پیو۔ پہنو اوڑھو۔ مگر دنیا اور دنیا کے اس سامان سے جی نہ لگاؤ۔ اس سے محبت نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ حضرت محبوب الٰہیؒ کے صدقے میں آپ کو ہمیشہ اسی طرح دنیا سے بے لوث رکھے جس طرح آپ اب تک رہے ہیں اور آپ اسی طرح سادگی اور خلوص کے ساتھ بنی نوع انسان کی

خدمت کرتے رہیں کہ سب کو

مگر بخدمت سلطاں بہ بند وصوفی باش

کی پرانی اشیرواد پوری ہوتی دکھائی دے۔

حسن نظامی سوسائٹی کے اراکین کو آپ سے بہ خصوصی تعلق بھی ہے کہ آپ حضرت خواجہ حسن نظامی کے کمالات کے پرانے قدردان ہیں۔ اور آپ نے ان کی تحریر و تقریر کو علم و ادب اور اصلاح و تنظیم سے لیکر احمد آباد کانگریس کی روداد تک یاد رکھا ہے۔ اسلئے بقول ذوق دہلوی آپ سے ملنے کا شرف ہم سب کے لئے کسی ہم دم دیرینہ کی ملاقات کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اور اس مسرت انگیز تقریب میں میں حسن نظامی سوسائٹی کے صدر مولوی فیاض الدین ہزاد دکن نظامی اور سب اراکین کی طرف سے آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ

وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

تاہم سوسائٹی کے اس راحت بخش اجتماع میں ایک پہلو غم کی خلش کا بھی ہے۔ جس کا ذکر کئے بغیر میں نہیں رہ سکتا۔ ہماری سوسائٹی کے روح رواں اور مجلس منتظمہ کے دو معزز رکن ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری زور اور ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب دہلوی آج ہم میں موجود نہیں ہیں۔ یوں تو ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ پہلی تقریب منعقد ہوئی ہے۔ اس لئے آج کے دن ان دونوں بزرگوں کی کمی کا شدت سے احساس ہونا لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ سوسائٹی کے ادبی اور علمی کاموں میں ان حضرات کے اٹھ جانے سے بڑا رخنہ پڑگیا ہے۔ حضرت خواجہ صاحب کے ادب پاروں کی ترتیب و تبویب اور ایک انتخاب کی تکمیل انہی کے ذمے تھی۔ لائبریری کی عمارت ہال اور حضرت خواجہ صاحب کے روضے کی تعمیر کے سلسلے میں بھی ان کے مفید مشورے مولوی فیاض الدین نظامی اور میرے لئے ہمیشہ کارآمد رہے۔ تاریخ اولیا، نظامی بنسری، سی پارہ دل اور ترتیلی قرآن مجید کی اشاعت وغیرہ کے سلسلے میں بھی ہم کو ہمیشہ ان کی رہنمائی میسر رہی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل رہنمائی اور توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی نے ان مرحوموں سے ایک اچھا کام کرایا اور اسی نے ہم کو تھوڑی بہت خدمت کی توفیق دی۔ اسی کے پاس ہم سب کو ایک دن جانا ہے۔ اسی سے دعا ہے کہ جس نیک اور اچھے مقصد کے لئے ہم کھڑے ہوئے ہیں زندگی کے چار دن سرخروئی کے ساتھ اس کی تکمیل میں بسر ہو جائیں۔ ہماری سوسائٹی کے سرپرست بھارت رتن محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ڈاکٹر بی گوپال ریڈی صاحب بھی اور ہمیں امید ہے کہ اللہ نے چاہا تو ان کی سرگرم دلچسپیوں اور اراکین کی مخلصانہ کوششوں کے ساتھ ہم اپنے کام کو جاری رکھ سکیں گے۔

آخر میں میں اپنے معزز مہمان نواب میر احمد علی خاں صاحب اور ان کے ساتھی مولوی باقر حسین قریشی کا ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور بقیہ حضرات کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے تشریف لاکر اس تقریب کی رونق بڑھائی۔

نواب صاحب کا جواب

نواب میر احمد علی خاں صاحب نے ایڈریس کے جواب میں سب سے پہلے موزوں اور مناسب طریقے سے اظہار تشکر کیا اور اس کے بعد حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی علمی ادبی اور قومی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو زبان حضرت خواجہ صاحب کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی کہ انھوں نے اسے مشکل پسندی سے نجات دلاکر عام فہم بنایا۔ اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ صرف عربی فارسی اور سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ ہی سے مافی الضمیر کو ادا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ عام فہم اور ہلکے پھلکے الفاظ بھی یہ کام کرسکتے ہیں۔ اردو شروع سے ایک عوامی زبان ہے اور اس نے ہندوستان کے مختلف عوامی عناصر کو قریب لانے اور ایک متحدہ تہذیب کو جنم دینے میں بڑا اہم پارٹ ادا کیا ہے اسلئے اردو میں مشکل پسندی کا رجحان اگر بڑھتا رہتا تو یہ زبان اور ملک دونوں کے لئے ایک نقصان دہ چیز ہوتی۔ خواجہ صاحب نے ایک بڑے اہم اور خطرناک موڑ پر اردو کو سنبھالا۔ اور اس کی خوبیوں اور افادیت کو برقرار رکھنے کا سامان کیا۔ اس لحاظ سے حسن نظامی سوسائٹی کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ اسی کو خواجہ صاحب کے مشن کا کام کرنا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرکے اور دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ حضرات کی کوشش سے خواجہ صاحب کے روضے کے ساتھ ایک خوبصورت قوالی ہال اور لائبریری کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ اور اس عمارت کی تکمیل کے بعد حضرت خواجہ صاحب کے جمع کردہ مخطوطات اور نادر کتابیں محفوظ اور مرتب صورت میں رہ سکیں گی۔ اور ذوق و شوق والے ان کتب اور نوادرات سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

نواب صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے ان کاموں کا تذکرہ بھی کیا جو حکومت آندھرا پردیش اردو کے لئے کر رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آندھرا میں اردو کو اہمیت دی گئی ہے۔ تسلیم کیا گیا ہے اور وہاں اردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں ہر قسم کی آزادی ہے۔ نواب صاحب کے اس بیان پر حاضرین نے خوب چیئرز دیئے۔

نواب صاحب نے تعلیمات تصوف اور حضرت محبوب الٰہی کی حیات مبارک کے سبق آموز واقعات کا تذکرہ بھی کیا اور فرمایا کہ ہمارے ملک کی بھلائی ان بزرگوں کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی میں ہے۔

نواب صاحب کی تقریر لکھی ہوئی نہیں تھی اس لئے اوپر اس کا محض خلاصہ مطلب درج کیا گیا ہے۔ ان کی تقریر کے بعد قوالی شروع ہوئی۔ اس استقبالیے میں بہت سے ایسے حضرات بھی تھے جو قوالی نہیں سنتے۔ اس لئے وہ پہلے ہی تشریف لے گئے لیکن سننے والوں نے دیر تک قوالی سنی۔ مغرب کی نماز سب نے جماعت سے پڑھی۔ اور نماز کے بعد بھی قوالی کا سلسلہ جاری رہا۔ بلکہ بعض اہل ذوق تو نواب صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد بھی قوالی سننے کے لئے ٹھیرے رہے۔ اور عشاء تک قوالی ہوئی۔ نواب صاحب کے ساتھ ان کی اہلیہ بھی تشریف لائی تھیں۔ ان کا خیر مقدم زنانے میں حضرت خواجہ بانو صاحبہ نے فرمایا۔

اس تقریب میں حضرت خواجہ ہلال قطبی صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب۔ حضرت صاحبزادہ احمد میاں صاحب فخری۔ حضرت حکیم سید احمد جمیل قادری۔ حضرت صاحبزادہ ناصر حسین صاحب صابری۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ورکنگ صدر جمعیۃ العلمائے ہند۔ مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری۔ مولانا حاجی محمد صالح صاحب۔ عبدالمجید صاحب ایڈمنسٹریٹر ہمدرد دواخانہ۔ لالہ شام ناتھ صاحب ڈپٹی منسٹر انفارمیشن۔ لالہ کپور چند صاحب۔ حافظ فیاض احمد صاحب انصاری سابق رجسٹرار جامعہ ملیہ۔ ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب ڈائرکٹر رورل انسٹی ٹیوٹ۔ سردار گوروت سنگھ جالی۔ پیرجی عبداللہ فاروقی صاحب ایڈیٹر خاتون مشرق مورخ اسلام مفتی شوکت علی صاحب فہمی ایڈیٹر دین دنیا و سیاسی دنیا۔ مولانا انیس الحسن منیجر الجمعیۃ اور مولانا سلیمان صابر ایڈیٹر الجمعیۃ بیگم صاحبہ تقی بلگرامی صاحب ڈائرکٹر مائنز حکومت ہند۔ مسٹر اور مسز مہندروا انجینئر۔ لالہ انوپ سنگھ صاحب بنیکر۔ آل انڈیا ریڈیو کے عربی سیکشن کے مولانا صدرالدین عامر اور مصر کے ریسرچ اسکالر ڈاکٹر احمد فائد جناب مصطفےٰ کمال شروانی۔ مولانا قاری ادریس صاحب پیش امام جامع مسجد نئی دلی۔ خلیل احمد صاحب مجسٹریٹ۔ مسٹر جوزف ل وغیرہ بہت سے معززین شریک تھے۔

حلقہ نظامیہ — نظامی بہائی پیر بیوں کا خبرنامہ — مرتبہ حسن ثانی نظامی

صوفیوں کی تاریخ

تاریخ عالم میں صحت اور حفاظت کا جتنا اہتمام تاریخ نبوی اور حدیث رسالت مآبؐ کے لیے ہوا شاید کسی تاریخ کے لئے نہیں ہوا۔ اور جو والہانہ تعلق اور محبت مسلمانوں کو اپنے رسولؐ سے ہے وہ محبت بھی شاید دنیا کی کسی پسندیدہ شخصیت کو میسر نہیں آئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم کو بکثرت موضوع حدیثیں نظر آتی ہیں اور ایسے آدمیوں کی بھی کمی نہیں ہے جنھوں نے اپنے آپ کو مسلمان کہلوایا، اور پھر اپنے دل سے باتیں گھڑ گھڑ کر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منسوب کرتے رہے۔

ان حالات میں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صوفیاء کرام کے سب ملفوظات موجودہ شکل میں صحیح سالم ہیں اور ہم کو ان پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آنا چاہیئے تو یہ اس کی بے عقلی ہوگی۔ جب لوگ ناموس رسولؐ کے ساتھ گستاخیاں کرنے میں نہیں شرماتے تو صوفیاء کا درجہ تو بہت بعد کا ہے۔ اس لئے ان کے ملفوظات میں ارادی اور غیر ارادی الحاق اور ترمیم و تبدل کا ہو جانا کوئی غیر ممکن بات نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر کوئی ان ملفوظات کا بالکل منکر ہو جائے۔ اور صحت کی کسوٹی پر کسے بغیر ان سب ملفوظات پر غلط اور من گھڑت ہونے کا الزام لگائے تو بھی مہمل بات ہوگی۔ کیونکہ انسانی عقل ایسی اپاہج نہیں ہے کہ وہ کھرے اور کھوٹے کی بالکل تمیز ہی نہ کر سکے۔

منادی کے اسی شمارے میں کسی اور جگہ جناب رشید حسن خاں کا ایک مضمون درج ہوا ہے۔ جس میں تاریخ ادب اردو علی گڑھ کی غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ میری نظر سے یہ تاریخ اب تک نہیں گزری ہے لیکن رشید صاحب کے مضمون سے معلوم ہوا کہ اس میں ہمارے خواجگان کے اکثر ملفوظات کو من گھڑت لکھا گیا ہے۔

ملفوظات کے من گھڑت ہونے کا قول اصل میں علی گڑھ کے پروفیسر حبیب صاحب کا ہے۔ جس سے بہت لوگ سوچے سمجھے بغیر متأثر ہو گئے ہیں۔ حبیب صاحب اپنے قول کے ساتھ عموماً یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بعض ملفوظات میں ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جو بہت بعد میں ہوئے۔

اس کے علاوہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظ خیر المجالس میں یہ روایت ملتی ہے کہ حضرت محبوب الٰہی رضؓ سے لیکر حضرت خواجہ غریب نوازؒ تک کسی چشتی بزرگ نے کوئی تصنیف نہیں کی۔ لہٰذا ان بزرگوں سے جو ملفوظات منسوب کئے جاتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کی تصنیف ہیں۔

حبیب صاحب یہ دلیلیں لاتے وقت کامن سنس کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اول تو جیسا کہ رشید صاحب نے لکھا ہے آپ سب ملفوظات کی نفی کسی ملفوظ ہی کے حوالے سے کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ آپ نے تصنیف اور تالیف کو ہم معنی کیونکر سمجھ لیا؟ ملفوظات تصنیف نہیں بلکہ تالیف ہیں ہر بزرگ نے اپنے پیر سے جو کچھ سنا اس کو نقل کر لیا۔ اس لئے اگر حضرت محبوب الٰہی یا حضرت چراغ دہلی یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی تو اس سے یہ کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کا لکھا ہوا ملفوظ راحت القلوب کسی دوسرے شخص نے لکھ کر حضرت سے منسوب کر دیا؟ راحت القلوب حضرت محبوب الٰہی کی تصنیف نہیں بلکہ تالیف ہے۔ اور اس کا تفصیلی تذکرہ خود محبوب پاک کی زبانی فوائد الفواد میں موجود ہے۔ اور فوائد الفواد کو جعلی کہنے کی جرأت حبیب صاحب بھی نہیں کر سکتے۔

یہ کہنا بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ ان ملفوظات میں غیر معاصر لوگوں کا تذکرہ ہے اس لئے یہ غلط ہیں۔ کیونکہ الحاق کے خطرے سے ہم نے کبھی انکار نہیں کیا۔ پہلے کتابیں قلمی ہوا کرتی تھیں اور نسخوں کی نقل اور صحت کا وہ اہتمام ممکن نہیں تھا جو آج کل ہے۔ لوگ کتابوں پر حاشیے بھی عموماً لکھا کرتے تھے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ بعض اوقات اصل کتاب کی نقل کے ساتھ حاشیے بھی نقل ہو گئے ہوں۔ اور امتداد زمانہ سے کتاب کا جزو بن گئے ہوں سیر الاولیاء میں تو خود ایک ناقل نے اپنے الحاق کا اعتراف کیا ہے کہ چونکہ اس کتاب میں فلاں چیز نہیں تھی اس لئے میں شامل کر رہا ہوں! یہی صورت اور

جگہ بھی ممکن ہے مگر ہم تحقیق اور ریسرچ کے بعد اصل اور نقل کو الگ کرکے ان ملفوظات کو ایڈٹ کر سکتے ہیں۔ اور یہ بات ناممکن نہیں ہے۔

حبیب صاحب نے امیر خسرو اکیڈمی دلی کے جلسے میں بھی اپنے اس قول کو دوہرایا تھا کہ ملفوظات من گھڑت ہیں اور اس سلسلے میں منادی نے ان سے استفسار کیا تھا۔ مگر ہمیں افسوس ہے کہ منادی کا یہ شمارہ ان کی خدمت میں رجسٹرڈ پوسٹ سے بھیجے جانے کے باوجود ہم ان کے جواب سے محروم رہے۔ ہمارا اندازہ ہوا کہ حقیقت میں اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اور محض اپنی بات کی پچ کے لئے وہ بلا دلیل اصرار کئے جاتے ہیں کہ ملفوظات من گھڑت ہیں۔ یہ طرز عمل ان جیسے مورخ کے شایان شان نہیں ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ تاریخ ادب اردو میں وہ مقالہ کس نے لکھا ہے جس میں ملفوظات کو من گھڑت اور صوفیائے کرام کو نہایت غیر ذمے دارانہ طریقے سے "خیرات لینے والے" بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ جن صاحب نے بھی یہ باتیں لکھی ہیں ان کی ذاتی تحقیق کچھ بھی نہیں ہے۔ انھوں نے بس حبیب صاحب کی لکھی پر لکھی ماردی ہے۔ تاریخ لکھنے والوں کو ایسی غیر ذمے داری کا ثبوت نہیں دینا چاہیئے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ یہ تاریخ علی گڑھ جیسی یونی ورسٹی کی طرف سے مرتب اور شائع ہوئی ہے۔

اصل میں ان خرابیوں کی ذمے داری ایک حد تک ہم لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کی جتنی توجہ عرسوں اور دیگر رسوم کی طرف ہے۔ اتنی توجہ دوسرے ٹھوس علمی کاموں کی طرف نہیں ہے۔ حالانکہ ان کاموں کی تبلیغی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر ملفوظات ریسرچ اور تحقیق کے بعد مرتب اور ایڈٹ کر دیئے جاتے تو آج ان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلنے کی نوبت بھی نہ آتی۔ ہمارے مشن کے کام میں یہ ملفوظات چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ بھی باقی نہ رہے تو ہم اندھیرے میں بھٹکنے لگیں گے۔

رشید حسن خاں صاحب نے جس تحقیق اور ذمے داری کے ساتھ تاریخ ادب اردو کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں اس کام کی کتنی صلاحیت ہے۔ کاش کہ ہم میں سے کچھ اہل ہمت اٹھیں۔ رشید حسن خاں صاحب جیسے لوگوں سے کچھ کام لیں اور کوئی ایسا مرکز قائم ہو جائے جہاں تصوف کی خدمت اس طرح بھی ہو سکے۔

اجمیر شریف کا عرس

حضرت خواجہ غریب نواز کا سالانہ عرس اس دفعہ بھی خوب دھوم دھام سے ہوا۔ ۵ ر اور ۶ ر رجب کو مجھے بھی حاضری کی سعادت میسر رہی اور چند پیر بھائیوں کی معیت میں حاضر اور غیر حاضر بھائیوں کی التجائیں پیش کی گئیں۔

حضرت سید اسرار میاں صاحب قبلہ متولی قدیم اور حضرت صاحبزادہ محمد حسین چشتی مرحوم کے ہاں کی مجالس میں بھی حاضری میسر آئی جہاں راگ کی آگ میں دلوں کو جلا جلا کر پاک کیا جاتا ہے۔ حضرت صاحبزادہ یوسف مہاراج صاحب کی گدی پر جو روضہ شریف سے ملحق ہے۔ حاضری کی بہت سی پرکیف گھڑیاں گذریں۔

برادر روحانی علی محمد نظامی صاحب کا تو سایے کی طرح ساتھ رہا جو مواجہ کا نقیب بن کر حاضری کا شوق دلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ حسن الدین نظامی صاحب اور حکیم حامد علی خاں نظامی وغیرہ بھائیوں اور پیر جی محمد صدیق نصیری اور محمد ایوب صاحب اور بمبئی والے سیٹھ محمد یوسف صاحب اور سیٹھ غلام محمد ڈوسل۔ اور سیٹھ محمد امین اور سیٹھ الیاس ذکریا وغیرہ احباب خاص کی ہم نشینی کا لطف بھی رہا۔ حضرت صاحبزادہ فضل احمد چشتی اور صاحبزادہ ایوب صاحب اور ان کے دیگر سب عزیز و اقارب کی خاطر داریاں بھی حاصل ہوئیں اور حضرت دیوان صاحب قبلہ نے بھی مخصوص نوازشوں سے کام لیا۔

بروش با من دل سوختہ لطف دگر است
ایں گدا بیں کہ چہ شائستۂ انعام افتاد

واپسی کلکتے والے سیٹھ الیاس صاحب اور غلام محمد ڈوسل اور محمد امین صاحب کے ساتھ ہوئی۔ ان نوجوان بھائیوں کو بزرگان دین سے جو عقیدت ہے۔ اس کی مثال نئی نسل میں مشکل سے ملے گی۔ قسمت والے ہیں! ہر ایک کے حصے میں یہ دولت نہیں ہوتی۔

شادیاں

یکم دسمبر ۶۳ء کو ڈربن افریقہ میں برادر روحانی عبدالمجید الف خاں نظامی کی صاحبزادی سارہ بی بی کی شادی حاجی محمد میاں سادق کے فرزند اکبر عبدالغنی صاحب کے ساتھ بخیر و خوبی منعقد ہوئی۔

عبدالمجید الف خاں صاحب نظامی کی دینی خدمات اور للّٰہیت سے اکثر پیر بھائی واقف ہیں۔ صادق صاحب بھی انکی برادری کے ایک ایسے رکن ہیں جن کو مذہب سے بڑا شغف ہے۔ اللہ تعالےٰ اس خدمت گزار گھرانے کی اس خوشی کو پائدار بنائے۔ اور دولھا دلھن بھی اپنے والدین کی طرح دینداری کی مسرتیں اور سعادتیں دونوں جہان میں حاصل کریں۔

عبدالمجید صاحب اور صادق صاحب ہندوستان سے بہت دور ہیں لیکن دینی اور روحانی تعلق میں اس قسم کی دوری کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور ہم سب نظامی ان کو ہمیشہ اپنے دلوں کے قریب محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کی اس خوشی میں برابر کے شریک ہیں۔ اور مبارکباد دیتے ہیں۔

---

۸ دسمبر کو دھولی میں ابن ندیم اللہ نظامی مرحوم کے فرزند اور ابن محمد ابراہیم نظامی کے چھوٹے بھائی۔ ابن نظام الدین کی شادی شیخ احمد صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ اللہ تعالےٰ بزرگان چشت کے صدقے میں اس شادی کو کامیاب فرمائے۔ اور دولھا دلہن شاد آباد رہیں۔

---

۱۱ نومبر کو سیالکوٹ میں عبدالحمید نظامی صاحب کی لڑکی وحیدہ خانم کی شادی عبداللطیف خاں صاحب کے صاحبزادے راجہ محمد امین خاں صاحب کے ساتھ ہوئی۔ جس کی اطلاع خواجہ عزیز نظامی نے دی ہے۔ اللہ اس شادی کو کامیاب و بامراد فرمائے۔

---

۱۴ دسمبر کو گوالیار میں برادر روحانی مولوی محمد فیاض الدین بہزاد دکن نظامی کے فرزند اکبر میاں ریاض الدین احمد نظامی آرکیٹکٹ کی شادی جناب جسٹس عبدالحکیم صاحب جج ہائی کورٹ گوالیار کی صاحبزادی طلعت جہاں ایم اے سے بصد شان و شوکت ہوئی۔ فیاض بھائی اور ان کی اہلیہ عزیز یا تو نظامی اور عبدالحکیم صاحب اور انکی بیگم صاحبہ اور مسز قمر طیب جی اور دیگر متعلقین ہم سب نظامیوں کی طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ (اس شادی کا تفصیلی حال انشاءاللہ آئندہ شمارے میں چھپے گا)۔

۵ ار دسمبر کو دلی میں حضرت حکیم خواجہ ہلال قطبی صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ حضرت خواجہ قطب صاحب کی شادی خانہ آبادی ہوئی۔ میں اس وقت دلی میں نہیں تھا اور گوالیار گیا ہوا تھا۔ اسلئے اب اپنی طرف سے اور سب نظامیوں کی طرف سے اس "شاہی شادی" کی مبارکباد بصد ادب نذر کر رہا ہوں۔ حضرت خواجہ قطب صاحب نائب سلطان الہند ہیں۔ اس لئے ان کے سجادہ نشین کی حیثیت بھی ہمارے لئے ایک شاہ اور شاہزادے کی ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کی خدمت میں مبارکباد نذر کی صورت ہی میں پیش کی جا سکتی ہے۔

نومبر میں بمقام بنگلور کلکتے والے آدم عبدالرحیم صاحب کا عقد ثانی ہوا۔ ان کی اہلیہ اول کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا۔ اتفاق سے اس شمارے میں حضرت خواجہ صاحب کے روزنامچے کا جو انتخاب درج ہوا ہے اس میں آدم بھائی کے عقد اول کا تذکرہ ہے۔ عبدالرحیم عثمان صاحب کا گھرانہ درویشوں سے خاص عقیدت رکھتا ہے۔ اور ہم لوگوں سے ان کے بڑے قدیم تعلقات ہیں۔ اللہ تعالےٰ آدم بھائی کے عقد ثانی کو مبارک کرے۔ اور ان کے گھر کو ہر طرح کی آبادی میسر آئے۔ آمین

عقیقہ ۱۳ اکتوبر کو دلی کے مشہور اہل خیر اور وضع دار بزرگ مولانا حافظ رحمت الٰہی صاحب معتکف نے اپنے پوتے جمال الٰہی سلمہٗ کے عقیقے میں اسلامی مساوات کی ایک عملی مثال قائم کی۔ اور مہتروں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ عقیقے کی دعوت میں دلی کے بےشمار مسلم اور غیر مسلم معززین شریک تھے۔ اور وہ سب اسلامی تعلیم کے اس نمونے سے بےحد متاثر ہوئے۔ اللہ حافظ رحمت الٰہی صاحب اور ان کے پوتے کو عمر دراز عطا فرمائے تاکہ ایسے نمونے برابر نظر آتے رہیں۔

دعائے صحت حضرت خواجہ بانو صاحبہ کی علالت ابھی تک باقی ہے۔ خون کے ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ ذیابیطس کا اثر خون پر بھی ہوا ہے۔ اور اس میں شکر کی خاصی مقدار ہے۔ علاج جاری ہے۔ پیر بھائیوں سے درخواست

ہے کہ وہ ان کی صحت کی دعائیں برابر کرتے رہیں۔ مولانا کشفی شاہ نظامی صاحب کی اہلیہ کی صحت یابی کے لئے دعا کی جائے۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار ہیں۔

مولوی عبد القادر حقدار شاہ نیلم نظامی کی اہلیہ بھی علیل ہیں۔ اور دھارواڑ اسپتال میں داخل ہیں۔ نظامی بھائی ان کے لئے بھی دعائے صحت فرمائیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ مولانا عشقی نظامی صاحب حالیہ آپریشن سے صحت یاب ہو گئے ہیں۔

اللہ عمر دراز کرے

بتاریخ ۱۹ دسمبر ۱۹۶۳ء اللہ تعالیٰ نے محمد اشرف نظامی ساکن لبّہ کو فرزند عطا فرمایا ہے جس کا نام غلام مصطفےٰ رکھا گیا ہے۔ اللہ عمر دراز اور نیک زندگی عطا فرمائے۔ اس ولادت کی اطلاع پیر سید مقصود علی شاہ نظامی صاحب نے دی ہے۔

سالانہ عرس

رمضان کے مہینے میں متعدد بزرگوں کے عرس ہوتے ہیں۔ ۳ رمضان حضرت فاطمہ زہرا کا یوم وصال ہے۔ ۸، ۹ رمضان کو حضرت بابا صاحب کے بھائی حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کا عرس ہے اور ۱۱ رمضان کو حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتی کا عرس ہے۔ ۱۷، ۱۸ رمضان کو حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کا سالانہ عرس دھوم دھام سے ہوگا۔ ۲۱ رمضان حضرت مولا علی کی شہادت کی تاریخ ہے امید ہے سب جگہ فاتحہ اور ایصال ثواب کی مجلسیں ہوں گی۔

حاجی عبد البشیر صاحب

نظامی بھائیوں کو یہ سن کر بڑا صدمہ ہوگا کہ نظامیہ درگاہوں کے پرانے خدمت گزار حاجی عبد البشیر صاحب نے ۲۰ اکتوبر کو وفات پائی۔ دلی کی تقریباً سب درگاہوں میں شامیانوں اور فرش اور روشنی کا انتظام اکثر و بیشتر مرحوم ہی کے سپرد تھا۔ اور دلی سے باہر بھی پانی پت اور ہوشیار پور وغیرہ مقامات پر انہی کے ذمے یہ خدمات رہتی تھیں اور وہ اپنے دونوں صاحبزادوں عبد الوحید صاحب اور عبد الحمید صاحب کے ساتھ رات دن ایسی لگن سے کام کرتے تھے کہ کہیں اس کی مثال نظر نہ آتی تھی۔

حاجی صاحب کی نماز جنازہ پہلے حضرت مولانا فخر صاحب کے مدرسے میں جس کا نام اب دلی کالج ہے ہوئی۔ اور بعد میں درگاہ حضرت محبوب الٰہی میں ہوئی۔ تدفین حضرت خواجہ حسن نظامی کے خاندانی قبرستان میں عمل میں آئی۔ دلی کے بے شمار مشائخ اور فقیر دوست جنازے کے ساتھ تھے۔ اور ہر جگہ مرحوم کی خدمات کا تذکرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ حاجی صاحب کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کے صاحبزادوں عبد الوحید صاحب اور عبد الحمید صاحب کو ان کا صحیح جانشین بنائے۔ اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح اولیاء اللہ کی بارگاہ میں مقبول رہیں۔

نواب بونٹہ بیگم صاحبہ

نواب زادی فردوس النساء بیگم دفا نظامی کی والدہ اور نواب منصور جنگ کی اہلیہ نواب بونٹہ بیگم صاحبہ نے بمقام ٹونک وفات پائی۔ مرحومہ بڑی خدا ترس اور نیک خاتون تھیں۔ اور خیر کے کاموں میں بڑی فراخ دلی سے حصہ لیتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ایک اور غمناک خبر ملی ہے کہ دفا صاحبہ کی ہمشیرہ زادی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر انتقال کر گئیں۔ اللہ تعالیٰ جوان لڑکی کے اس صدمے کی سہار مرحومہ کی والدہ خالہ اور نانا کو عطا فرمائے اور بچوں کا حافظ و نگہبان رہے۔ نظامیہ برادری سے درخواست ہے کہ مرحوموں کے لئے دعائے مغفرت کرے۔ میں سب کی طرف سے نواب عبد الشکور خاں منصور جنگ صاحب سے تعزیت کرتا ہوں۔

مولانا مظہر اللہ ظہوری نظامی

حیدرآباد کے پیر بھائی اور جامعہ عثمانیہ کے سابق رجسٹرار مولانا مظہر اللہ ظہوری نظامی نے بھی وفات پائی مرحوم سلسلے کے بڑے پرانے رکن تھے۔ کچھ عرصے سے گوشہ نشین سے تھے۔ ان کے انتقال کی اطلاع بھی بہت دیر میں ملی۔ اللہ ان کی روح کو رحم و کرم سے نوازے۔ اور ان کے قائم مقاموں میں انہی جیسی خوبیاں پیدا کرے۔

ظہوری نظامی مرحوم اور ان کی اہلیہ کو علم و ادب سے بھی بڑا شغف تھا۔

طبی کمپنی دہلی

کی

بے حد مفید اور فوراً اثر کرنے والی دوائیں

ارسطو کا چورن ارسطو کا چورن یونانی طب کے نسخہ سے بنا ہے جو مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے دادا حکیم شریف خاں صاحب کی بیاض کا نسخہ ہے۔ ہاضمہ کی درستی کے لئے اس سے بہتر چورن آج تک اور کہیں نہیں بنا۔ معدہ اور جگر کی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ جگر کے اعصاب کو قوی کر دیتا ہے۔ ہضم ثانی کی شکایات دور ہو جاتی ہیں۔ تازہ خون جسم میں پیدا ہونے لگتا ہے۔ بھوک بڑھ جاتی ہے۔ ہاضمہ اچھا ہو جاتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد ڈیڑھ ماشہ چورن پھانک کر اوپر سے پانی پی لیجئے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

طبی سرمہ یہ سرمہ طبی کمپنی نے خاص اہتمام سے تیار کیا ہے۔ آنکھوں کی ہر تکلیف کو دور کر دیتا ہے۔ بینائی میں ترقی دیتا ہے۔ تندرست لوگ استعمال کریں تو آنکھوں کی ہر تکلیف سے محفوظ رہتے ہیں اور بینائی بڑھ جاتی ہے۔ عورتوں بچوں اور ہر عمر کے مردوں کے لئے مفید ثابت ہوا ہے۔ تکلیف کی حالت میں صبح دوپہر شام اور سوتے وقت لگایا جائے۔ ورنہ رات کو سوتے وقت استعمال ہو۔

قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ

پائیریا منجن یہ منجن دانتوں کی موذی بیماری پائیریا کے لئے تیر بہدف ہے۔ مسوڑھوں سے خون اور پیپ نکلتی ہو۔ اور منھ میں سے بدبو آتی ہو تو اس کا فوری علاج پائیریا منجن سے کیا جا سکتا ہے۔ صحت مند لوگ اسے استعمال کر کے اپنے دانتوں کو مضبوط اور چمکتا ہوا رکھتے ہیں۔ اور بہت سی بیماریوں سے جو دانتوں کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں محفوظ رہتے ہیں۔ اس منجن کا استعمال کرنے کے بعد آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ ٹوتھ پیسٹ سے کتنی بہتر چیز ہے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

سب دواؤں کا محصول علاوہ

طبی کمپنی سے براہ راست منگائیے یا اس کے ایجنٹوں سے خریدئیے۔

پتہ:- طبی کمپنی ۱۷ - حضرت نظام الدین - نئی دہلی ۱۳